مسلمانوں
کا
عروج اور زوال

جس میں اوّلاً خلافتِ راشدہ پھر مسلمانوں کی مختلف حکومتوں، ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کی عام اجتماعی اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کرکے ان اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط و زوال میں موثر ہوئے ہیں

تالیف

مولانا سعید احمد ایم۔ اے

نیجر ندوۃ المصنفین دہلی کی نگرانی میں

سنہ ۱۳۶۱ھ جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی ۱۹۴۲ء

فہرستِ مضامین

۷۸۶

یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے اس کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اکتوبر ۴۱ء میں خاکسار نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی انجمن تاریخ و تمدن اسلامی کے ماتحت "اسباب عروج و زوالِ امت" کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی۔ بعد میں اسے قلمبند کر کے بہت کچھ اضافوں کے ساتھ برہان میں شائع کر دیا گیا تھا۔ اب بعض احباب کے اصرار پر اسی مضمون کو چند در چند اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ قارئینِ کرام اسے پڑھکر خود اندازہ کر لیں گے کہ یہ کتاب نہ تاریخ اسلام ہے اور نہ تاریخ پر کوئی مفصل تبصرہ ہے بلکہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخِ اسلام کے اُن چند واقعات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو مسلمانوں کے عروج و زوال میں موثر ہوئے ہیں تاکہ ہم ماضی کی داستان سے مستقبل کے لئے کوئی روشنی حاصل کر سکیں ❖

سعید احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں کا عروج اور زوال

تاریخ عالم کا یہ واقعہ کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں نے نہایت محیر العقول طریقہ پر ترقی کی اور اپنے کارناموں کا نقش صفحۂ تاریخ پر اس طرح ثبت کیا کہ دنیا کی دوسری قومیں ان کی عظمت و برتری کے سامنے سر اطاعت خم کر دینے پر مجبور ہو گئیں۔ اب وہی مسلمان ہیں جن پر فلاکت و ادبار مسلّط ہے، ان کا شیرازۂ ملی پراگندہ ہے۔ اب ان کی محفلوں میں علم و فن کے مذاکرے بہت کم ہوتے ہیں۔ دماغ قوتِ ابداع و اختراع سے محروم، اور ہاتھ سیاسی طاقت و قوت کی عنان سے ناآشنائے محض ہیں، مردم شماری کے لحاظ سے اتنے مسلمان پہلے کبھی نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں مگر ساتھ ہی علم و عمل، ایمان و ایقان اور روحانیت و اخلاق کے لحاظ سے جتنے پست اور زبوں حال اب ہیں اتنے بھی کبھی نہیں تھے۔ تاریخ اسلام کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند سالوں بعد ہی مسلمانوں نے جزیرۃ العرب سے نکلکر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنا شروع کیا تو سخت ترین عداوتوں اور حوصلہ فرسا مقاومتوں کے باوجود اس انداز سے آگے بڑھتے رہے کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پہلے انھوں نے مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لئے اور ان ملکوں میں صرف سیاسی طاقت و قوت ہی حاصل نہیں کی۔ بلکہ اسلام کی حقانی تعلیمات اور اسلامی تمدن و تہذیب کی ناقابلِ رد دلکشی نے اپنا ایسا رنگ جمایا کہ چند ملکوں کو چھوڑ کر تمام مفتوحہ ممالک خالص اسلامی ملک بن گئے۔ پھر علوم و فنون میں، ایجادات و اختراعات میں، تہذیبِ نفس اور نظامِ اخلاق کی

ترتیب و تدوین میں انھوں نے اپنی ذہنی و دماغی عظمت و برتری اور مافوق العادۃ عملی جد و جہد کا ایسا عمدہ ثبوت دیا کہ بڑے سے بڑا معاند مورخ بھی ان کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ لیکن اب حالت بالکل دگرگوں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان پر ادبار و انحطاط کا تسلط ہے اور علم و عمل کے ہر میدان میں وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ کہیں جہالت و نادانی کا دور دورہ ہے اور کسی جگہ دوسری اقوامِ عالم کی تقلید کا سودا ہے، اسلامی انفرادیت بہرحال اسقدر مضمحل ہو چکی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی پہلے زمانہ کے مسلمانوں کا جانشین یا ان کے منصبِ عظمت کا وارث کہنا اپنی ہنسی خود آپ اڑانے کے مترادف ہے۔

اس انقلابِ عظیم کو دیکھکر فلسفۂ تاریخ کے طالب علم کو قدرتی طور پر ان اسباب کا کھوج لگانے کی جستجو ہوتی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کی ماہیت یکسر منقلب ہو کر رہ گئی ہے لیکن ان اسباب کو بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے اجمالاً ان بنیادی عوامل و دواعی کو معلوم کر لیا جائے جو مسلمانوں کی عظیم الشان ترقی کا باعث بنے اور جنھوں نے یکجا ہو کر ان کو دنیا کی سب سے بڑی اور صلح ترین قوم بنایا۔ ان عوامل و دواعی کو معلوم کرنے کے بعد آپ تاریخی اعتبار سے دیکھیں گے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف اندرونی اور بیرونی اثرات کے ماتحت ان عوامل میں کس طرح اضمحلال پیدا ہوتا رہا۔ اور آخر کار کئی صدیاں گذرنے کے بعد جب یہ تدریجی اضمحلال اپنے آخری نقطہ تک پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ بد وہ ہوا جو آج ہم سب کے سامنے ہے اور جس کا دردانگیز نظارہ ہر حساس مسلمان کی آنکھ کو ایک پیہم دعوتِ خوننابہ فشانی اور ہر دردمند دل کو مسلسل اذنِ فغاں سنجی و ماتم سرائی دے رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مختصر صحبت میں ایک ہزار برس سے زیادہ کی روئدادِ غم تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے میں اصولی طور پر صرف چند اہم امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

حکمت | ارباب علم جانتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک سوچنے اور غور کرنے کی قوت، جس کو قوتِ نظری کہتے ہیں۔ یہ قوت اشیاءِ عالم کی حقیقتیں دریافت کرتی اور ان کی کنہ و ماہیت کا کھوج لگاتی ہے

پھر مختلف اعمال وافعال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا عمل اچھا ہے اور اس لئے لائقِ اخذ ہے اور کونسا عمل برا ہے اور اس بنا پر قابلِ ترک ہے۔ قوتِ نظری کے اس فیصلہ کے بعد دوسری قوت یعنی قوتِ عملیہ کو تحریک ہوتی ہے اور وہ قوتِ نظری کے فیصلہ کے مطابق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک کرتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کا تعلق انسان کے نفس سے ہے۔ ایک مبدأ ادراک ہے اور دوسری مبدأ تحریک۔ پھر ان دونوں قوتوں کے ماتحت مختلف قوتیں ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ اثر و عمل میں کام کرتی ہیں۔ تمام فلسفۂ اخلاق کی بنیاد انھیں دونوں قوتوں کے محرکات و ہیجات اور ان کے مقتضیات و مظاہر سے بحث کرنے پر قائم ہے۔ انھیں دونوں قوتوں کی بے اعتدالی سے جب یہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتی ہیں رذائلِ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جب ان میں اعتدال پایا جاتا ہے تو ان سے فضائلِ اخلاق کا ظہور ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کہتے ہیں وہ انھیں دونوں قوتوں کے استکمال کا نام ہے اور یہی حکمت ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی اساس و بنیاد ہے۔ اس بنا پر زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی بہرحال اس کی کامیابی اور ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ شخصی و انفرادی یا قومی و اجتماعی قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں تندرست ہوں۔ افراط و تفریط سے الگ ہوں اور اعتدال پر قائم رہ کر کسی چیز کو حسن یا قبیح سمجھنے یا کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کے بارہ میں وہی رویہ اختیار کریں جو صحیح معنی میں ایک تندرست اور معتدل قوت کو اختیار کرنا چاہیے۔ جس طرح ہر انسان میں ایک قوتِ نظری اور ایک قوتِ عملی ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس اعتبار سے پوری قوم کی ایک قوتِ نظری ہوتی ہے جس کے آئینہ میں وہ اشیاءِ عالم کے حسن و قبح کو دیکھتی اور جانچتی ہے اور پھر اسی طرح ایک ہی اس پوری قوم کی قوتِ عملی ہوتی ہے جس کے باعث قوم کے تمام افراد متحد و متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں۔ اس وقت ان افراد کے عقائد و اعمال میں ایک ہم آہنگی، یکسانیت اور استواری پائی جاتی ہے۔ ان سب کا مرکزِ نگاہ ایک ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ کے ماتحت

ان کی تمام حرکات ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس قوم کے مزاج میں فتور نہیں آیا ہے اور اس کا دماغ اور اس کے اعضاء و جوارح تندرست ہیں تو اس قوم کا ہر اقدام مستحسن اور اس کا ہر عمل نیک ہوگا اور یہ قوم دنیا کے تمام انسانوں کے لئے رحمت و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ وہ جس کسی سمت کا رُخ کرے گی باطل او شر و فساد کی تمام ظلمتیں خود بخود چھٹتی چلی جائیں گی۔ اور حق و صداقت کے آفتاب کی شعاعیں لمحہ بلمحہ وسعت پذیر ہوتی رہیں گی۔

اس مختصر ترین تمہید کے بعد اب اسلام کی تعلیمات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا، تمام اسلامی تعلیمات اصولی اور اساسی طور پر صرف دو چیزوں سے متعلق ہیں ایک انسانی عقیدہ اور دوسری انسانی عمل و کردار، عقیدہ کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اور عمل و کردار کا تعلق قوتِ عملیہ سے۔ بالفاظِ صحیح تر یوں سمجھئے کہ اسلام نے ان دونوں قوتوں کے حدودِ عمل اور ان کے فرائض و واجبات کی تعیین کرکے انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا دستورِ محکم دیدیا ہے جس کی روشنی میں بالکل صاف طریقہ پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قوتِ نظری کو کس چیز کے متعلق حسن ہونے اور کس شے کی نسبت قبیح ہونے کا حکم لگانا چاہئے اور اسی نسبت سے قوتِ عملی کو مرغوبات و مکروہات کی دنیا میں کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے، اسلام کا دستورِ اساسی یعنی قرآن مجید اول سے آخر تک انھیں امور کی تشریح و توضیح اور انھیں حدود و قیود کے بیان و تفسیر پر مشتمل ہے اور اس بنا پر یہ کہنا قطعًا بے مبالغہ ہے کہ اسلام کا منشا انسان کی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل و مکمل کرکے اسے حکمتِ بالغہ کا درس دینا اور اس طرح اس کو حقیقی طور پر اشرف المخلوقات بنانا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنین کے حق میں اپنا ایک بہت بڑا احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ	بیشک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس
بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا	نے انھیں کے درمیان میں سے ایک رسول بھیجا، وہ

عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ — ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے اور

الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ — ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ پہلے

قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ٥ — کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہی وہ حکمت ہے جس کو قرآن مجید کی آیت" وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا" میں خیر کثیر فرمایا گیا ہے۔ حکمت کو خیر کثیر فرمانے کی وجہ سے ہی علماء اخلاق نے کہا ہے کہ حکمت صرف علم کا نام نہیں بلکہ عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے، کیونکہ جو علم بغیر عمل کے ہو اس کا خیر کثیر ہونا تو کجا وہ تو سراسر وبال اور مصیبت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے" جو علم بغیر عمل کے ہو وہ وبال ہے اور جو عمل بغیر علم کے ہو وہ ضلال ہے" غرض یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا دستور العمل اور نظام نامۂ اخلاق و عقائد ہے کہ اگر قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں کی حرکت اس دستور کی روشنی میں ہوگی تو ان قوتوں کے مالک میں حکمت پیدا ہو جائے گی۔ جس طرح کوئی شخصِ واحد اپنے تمام عقائد و اعمال کی بنیاد اس پر رکھیگا تو اس کی زندگی بہمہ وجوہ کامیاب ہوگی، ٹھیک اسی طرح جو قوم اس قرآن کو عقیدہ اور عمل دونوں میں اپنا اسوہ بنائے گی وہ بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ صالح اور کامیاب ترین قوم ہوگی اور اسے حق ہوگا کہ سب سے بلند اور ارفع ہو کر رہے۔ آپ یہ نہ خیال کریں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ دعویٰ محض کسی خوش اعتقادی پر مبنی ہے۔ اب میں اس کے دلائل بیان کرتا ہوں۔

حکمت کے تمام اقسام کو بیان کرنا اور پھر اسلامی عقائد و اعمال کی ان پر تطبیق کرنا ایک طویل فرصت کا طالب ہے۔ اس لئے میں یہاں مختصراً اسلامی عقائد و اعمال میں سے بعض بنیادی امور کا ذکر کرتا ہوں جن کو مسلمانوں کے عروج و ترقی میں نمایاں دخل ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے انسانی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل بنانے کے سلسلہ میں کس خاص نقطۂ نظر کو مرعی رکھا ہے اور مسلمانوں کے قومی کیرکٹر پر ان کا کیا اثر ہوا ہے۔

توحید | توحید کا تعلق قوتِ نظری سے ہے، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلامی عقائد کی اساس و بنیاد اسی عقیدہ پر قائم ہے اس عقیدہ کا مفاد یہ ہے کہ انسان ذات و صفات میں کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے، وہ دل سے اس بات کا یقین رکھے کہ دنیا کے تمام نفع و ضرر کا مالک صرف خدا ہے، وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کے مخلوق، ہم سب صرف اسی کی اطاعت اور عبادت کریں گے کسی اور چیز کے سامنے اپنی پیشانی نہیں جھکائیں گے، ہمارا رزق، موت، زندگی، عزت و ذلت، کامرانی و ناکامی، دولت و غربت، ان سب کا ملنا ملانا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خواہ اپنے زمانہ کا کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو، ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ذرا بھی مالک و مختار نہیں ہے۔ اس بنا پر ہمیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیے۔ اسی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے اس کو طلب کرنا چاہیے۔ اس یقین و اذعان کے ساتھ دل سے اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ انسان انسان سب برابر ہیں کوئی کسی کا حاکم اور کوئی کسی کا محکوم نہیں۔ کسی شخص کو کسی دوسرے پر آمرانہ چیرہ دستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قانون کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی قانون بنا کر اس کو بندگانِ خدا پر لازم کر دے البتہ نظامِ زندگی کو چلانے کے لئے صلاحیت و استعداد کے مطابق تقسیمِ عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس بنا پر کوئی امیر ہوگا اور کوئی وزیر، کوئی قاضی اور مفتی ہوگا، اور کوئی صنّاع و تاجر۔ لیکن ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی ذاتی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہوگی۔ مرتبۂ انسانیت میں یہ سب برابر ہیں، ان کی مثال ایک بڑے انجن کے پرزوں کی سی ہے کہ یہ تمام پرزے اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں تو انجن چلتا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی ٹرین کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ پس تمام بھلائیاں اور حقیقی فلاح و بہبود انھیں خوش نصیب انسانوں کے لئے ہے جو اپنی ہستی کو خدا کے وجودِ ابدی و سرمدی میں فنا کر کے اپنی کوئی ذاتی خواہش اور جذبہ رکھتے ہی نہیں۔ ان کی محبت، عداوت، فقیری و درویشی، امارت و ثروت اور اہلِ عالم سے مختلف باہمی تعلقات اور ان کی رعایت یہ سب صرف خدا کے لئے اور اسی کے حکم کے ماتحت اور اسی کا فرضِ بندگی بجا لانے

کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہ انجن کے پُرزوں کی طرح اپنے ذاتی نفع وضرر سے بے خبر ہو کر محض خدا کی رضاجوئی کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ اللہ کے قانون سے سرکش و باغی ہیں اور دنیا میں شر و فساد پھیلاتے ہیں ان کی مثال اس پتھر کی سی ہے جو گاڑی کو روکنے کے لئے ریلوے لائن پر ڈالدیا گیا ہو، ظاہر ہے اگر پتھر چھوٹا سا ہی ہے تو اس کو انجن کی تیز رفتاری خود بخود راستہ سے دور کردیگی اور لائن صاف ہوجائیگی۔ اور اگر پتھر کی کوئی چٹان حائل ہوگئی ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے زیادہ کدوکاوش کرنی پڑیگی۔ بہرحال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کی شاہراہ پر حیاتِ اجتماعی کا انجن چلانے کے لئے جس طرح ضرورت ہے کہ انجن کے تمام پرزے ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ لائن کو صاف رکھا جائے اور اس پر اگر کوئی پتھر وغیرہ گر پڑے تو اسے دور کردیا جائے۔

عقیدۂ توحید کی اس مختصر تشریح کے بعد آپ خود معلوم کرسکتے ہیں کہ جو قوم اس عقیدہ کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں رکھے اور صرف زبان سے اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اس عقیدہ کی ایسی اذعانی اور یقینی کیفیت اس کے دلوں میں مرتسم ہو کہ لاکھ منطقی دلائل کے باوصف اس میں ذرہ برابر تذبذب پیدا نہ ہوسکے کیا ایسی قوم کبھی کسی جماعت کی محکوم ہو کر . . . . زندگی بسر کرسکتی ہے؟ اسی عقیدہ کا اثر تھا کہ دورِ اول کے مسلمان اپنے وجود کی انفرادیت کو یک قلم بھلا کر اپنے آپ کو خدا کے وجود کا ایک پرتو سمجھتے تھے اور گویا ان کے ہر بُنِ مو سے یہ صدا آتی تھی ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس یقین کے باعث ان کی نگاہ بلند تھی۔ حوصلے عالی اور ہمتیں ناقابلِ شکست و زوال تھیں، ان کا ایمان تھا کہ ہمارا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب خدا کے لئے ہے، ہمارا مقصدِ زندگی خدا کے احکام کی بجا آوری اور اس کے اوامر و نواہی کی دنیا میں تبلیغ و اشاعت ہے اور بس۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مصرف ہی نہیں ہے۔ اس قوی تصور اور ایمانِ محکم کی وجہ سے ایک طرف وہ دنیا کی

بڑی سے بڑی شہنشاہیت اور دنیوی جاہ و حشم سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسری جانب چونکہ ان کے عزائم مستحکم اور ایک مرکزِ لاہوتی سے وابستہ ہوجانے کی بنا پر ان کے ارادے پہاڑ کی طرح مضبوط اور اٹل تھے اس لئے ان کے واسطے کوئی مانع مانع نہیں تھا۔ فلسفۂ خودی کا یہی وہ راز ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھا اور جس نے مختلف ملکاتِ اخلاق کی شکل میں ظاہر ہوکر ان سے حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر کرائے۔ جو لوگ قوتِ ارادی کی عجوبہ زائیوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہیئے کہ ایک قوم عالم کے مبدأ فیاض سے اپنا رشتہ استوار کرکے دنیا میں کیسے کیسے عجیب و غریب کارنامے کرسکتی ہے۔

اتقاء یہاں تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلام نے عقیدۂ توحید کی تلقین و تعلیم دے کر انسان کی قوتِ نظری کو کس درجہ معتدل، صالح اور درست بنادیا اور کس طرح اس کو اشیاء کے حسن و قبح معلوم کرنے کا ایک معیار بتادیا ہے کہ جو چیز بھی اس معیار پر پرکھی جائے گی اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اب اجمالاً بعض ان اعمال کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا جو اسلام نے قوتِ عملی کی تہذیب و تربیت کے لئے منصوص کئے ہیں۔

توحید کا قائل ہوجانے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے خدا خوش ہوتا ہے اور جن کو کرنے سے اس کی رضامندی حاصل ہوتی ہے اور وہ اعمال کیا ہیں جو اس کے قہر و غضب کا موجب بنتے ہیں۔ عقائد کے علاوہ اسلام کی تمام تعلیمات انھیں اعمال کے بیان اور ان کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ ان تمام اسلامی اعمال و افعال میں افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ بالفاظِ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام اسلامی اعمال کی بنیاد اتقاء پر قائم ہے یعنی وہ معاملات جن کا تعلق اللہ اور بندہ کے تعلق سے ہے اور وہ معاملات جو ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے معاملات میں بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی

اعمال وافعال کا مقصد حکم خداوندی کی بجاآوری ہے۔ یہانتک کہ اگر باپ بیٹے پر خرچ کرتا ہے، یا بیٹا باپ کی تعظیم وتکریم کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہیئے کہ چونکہ خدا نے اس تعلقِ اُبوت وبنوت کی بنا پر مجھکو یہ حکم دیا ہے اس لئے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اگرچہ اس فعل سے حظِ نفس بھی ضرور حاصل ہوگا۔ لیکن ذاتی حظِ نفس کا حصول مقصدِ کار نہ ہونا چاہیئے۔ اس ایک مثال پر ہی دوسرے شخصی اور بین الاقوامی تعلقات کو قیاس کر لیجیئے۔ غرض یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں روحِ اتقاء کے کارفرما ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قبائل وافراد کو قبائلی عصبیت اور دوسرے اور تعصباتِ جاہلیت مثلاً وطنیت، رنگ ونسل کی برتری، دولت وثروت کا غرور، جسمانی طاقت وقوت کا گھمنڈ، خودغرضی، نفس پرستی اور تن پروری، باہمی تباغض وتحاسد، خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، ان میں سے ہر ایک لعنت سے نجات مل جاتی ہے، اور ان لعنتوں میں گرفتار ہوکر انسانیت کو جس درد وکرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انسانی سوسائٹیاں ان سے محفوظ ہوکر امن وعافیت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

اسلامی اوامر ونواہی کا مطالعہ آپ علم النفس کی روشنی میں کیجیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے قوائے عملیہ میں سے کسی قوت کو نہ تو بالکل جامد وخامد کرنا چاہا ہے اور نہ اس کو بالکل مطلق العنان چھوڑا ہے کہ جو چاہے کرے بلکہ بشری تقاضوں کو ملحوظ رکھکر ہر ایک قوت کے حدودِ عمل کی تعیین وتحدید کر دی ہے، مثلاً قوتِ شہوی کا کام ہے جلبِ ملائم اور قوتِ غضبی کا دفع مضار، تو اسلام نے یہ بتایا کہ درحقیقت ملائم یا مرغوب کونسی چیز ہے اور کونسی نہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اگر یہ چیز ملائم ومرغوب ہے تو اس کے جلب وتحصیل کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اس کی بھی تشریح کر دی کہ یہ جلب وتحصیل کتنا ہونا چاہیئے؟ اس کی کتنی مقدار نافع ہے اور کتنی مضر! اسی طرح قوتِ غضبی کا کام ہے دفع مضار، تو اسلام نے اس قوت کی تہذیب کے لئے بتایا ہے کہ واقعی مضار کون کونسی چیزیں ہیں، پھر یہ کہ جو چیزیں مضر یا مؤلم ہیں ان کو کس طرح دفع کرنا چاہیئے، اسلامی تعلیمات کی یہی وہ جامعیت اور موزونیت ہے جس کی وجہ سے ان میں اتنی لچک ہے کہ

وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر اور ہر شخص کے لئے لائقِ عمل ہیں۔

عقیدۂ توحید وانقار کا مجموعی اثر

اسلامی عقائد واعمال کی اس روح کو معلوم کر لینے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو سوسائیٹی ان پر کاربند اور عمل پیرا ہوگی اسے بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب، شائستہ اور مدنیتِ صالحہ کا مالک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہی وہ سوسائٹی ہوگی جس کے دلوں میں کسی شخص یا کسی قوم کے خلاف ذاتی نفرت وعناد کے جذبات نہیں ہوں گے، یہ جماعت حق کی علمبردار اور باطل کے لئے آہنی دیوار یا ایک تیز تلوار ہوگی۔ اس کی نظر میں امیر وغریب، شاہ وگدا، گورے اور کالے، عربی اور عجمی سب برابر اور یکساں ہوں گے، ذاتی خصومت اور شخصی بغض وعناد کے باعث اس جماعت کا کسی شخص یا کسی قوم سے کوئی بگاڑ نہ ہوگا، ملک گیری یا ملوکیت پرستی کا اس جماعت کے وہم وگماں میں بھی گذر نہیں ہوسکتا۔ عام بندگانِ خدا کی رفاہیت اور ان میں اُنس وعافیت کی فضا قائم کرنا ان کا اولین مطمحِ نظر ہوگا۔ دوسری طرف اس جماعت کو خدا پر بھروسہ ہوگا۔ اور اس لئے یہ جس کام کا عزم کرکے اٹھیگی اُسے مخالفت ومقاومتِ شدید کے باوجود پورا کرکے رہیگی۔ اس جماعت کا امیر ذی شان صاحبِ علم ونشان ایک گدائے گوشہ نشین کی طرح متواضع منکسر اور فروتن ہوگا۔ اور وہ اپنی دولت و امارت کو عطیۂ خداوندی سمجھکر اُسے خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیگا اور پھر جو ان میں فقیر و مفلس ہوں گے ان کے ہاتھ اگرچہ خالی ہوں گے اور ان کے گھروں میں شاید بوریئے بھی نہ ہوں لیکن ان کی آنکھوں میں استغنار کا نور چمکتا ہوا ان کی پیشانیوں سے قناعت وصبر کا اطمینان برستا ہوا نظر آئیگا۔ قلتِ مال بلکہ فقدانِ مال کے باوجود دبدبۂ سکندری ان کے چہرہ بشرہ سے عیاں اور جاہ وجلالِ فریدونی ان کی صورت وشکل سے آشکارا ہوگا، یہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا، جدھر یہ رُخ کریں گے اقبال وظفر مندی ان کے قدم لے گی، ان کو ہتھیاروں اور توپ وتفنگ کی بھی ایسی چنداں ضرورت نہیں ہے، یہ جس طرف نگاہ اٹھائیں گے قوموں اور جماعتوں کی تقدیروں کو پلٹ کر رکھدیں گے

یہ جس زمین پر اپنے گھوڑے دوڑائیں گے زمین اپنے خزانے اگل کر ان کی کنجیاں ان کے ہاتھوں میں دیدیگی، صرف خشکی میں اور زمین کے اوپر نہیں بلکہ سمندروں کی طوفانی موجوں میں بھی حق کا علم سرفراز و سربلند کرنے کے لئے یہ کود پڑیں گے تو یہ متلاطم موجیں بھی ان کے عزائم روک نہ سکیں گی، اب آپ عہدِ صحابہؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے اور بتایئے کہ ان اوصاف کی حامل کیا ان صحابہؓ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور جماعت بھی ہوئی ہے؟ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں ذرہ برابر شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے جس کی شہادت تاریخ کے صفحات اب بھی دے رہے ہیں، دنیا میں بڑے بڑے بہادر اور شیر افگن رستم و سہراب پیدا ہوئے مگر بتاؤ کسی قوم میں کوئی بہادر علیؓ جیسا بھی پیدا ہوا جس نے اپنے سخت ترین دشمنِ جان کافر کو اس پر قابو پالینے کے بعد محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا تھا کہ اب اگر وہ اس کو قتل کرتے تو اس میں ذاتی انتقام کا شائبہ بھی پیدا ہوا جاتا تھا، دنیا میں بڑے بڑے عادل، انصاف پسند اور رحمدل بادشاہ گذرے ہیں مگر کوئی قوم عمرؓ جیسا بھی کوئی حکمراں پیش کر سکتی ہے جو پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنکر اور فرشِ خاک پر بیٹھکر عرب و ایران کی قسمتوں کے فیصلے کرتا تھا اور جسے بیوہ اور غریب عورتوں کے چولھوں میں آگ جلانے اور کھانا پکانے میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا۔ قوم و وطن کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنے والوں کی کمی نہیں، لیکن انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ بھی خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے کہ فتنہ پردازوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا ہے، یہانتک کہ ایک شخص آپ کے مکان میں داخل ہو کر آپ کو قتل بھی کر دینا چاہتا ہے مگر صاحبِ خلافت و امارت ہونے کے باوصف آپ ان لوگوں کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کو بھی تلوار اٹھانے کی اجازت محض اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں فتنہ کے دروازہ کا کھلنا آپ کی ہی طرف منسوب نہ کیا جائے، غور کرو، انتہائی شجاعت و دلیری کے ساتھ یہ تواضع و فروتنی اور خدا ترسی، سیاسی طاقت و قوت کے باوجود معمولی درجہ کے انسانوں کے ساتھ

بالکل مساویانہ بلکہ خادمانہ برتاؤ، شدت وصولت کے ساتھ رحمدلی اور رقت، فقیری اور مفلسی کے ساتھ کامل استغنا اور اطمینانِ نفس، کمالِ دولت وایالت کے ہوتے ہوئے یہ حیرت انگیز بےنفسی اور بےغرضی قبائلی عصبیت کی مسموم آب وہوا میں پرورش پانے کے باوجود اسلام قبول کرتے ہی ان میں ایسا انقلاب پیدا ہو جانا کہ اسلام قبول کرکے جوان کا بھائی بن جاتا ہے اس کے لئے یہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے دل وجان سے آمادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ عہدِ جاہلیت میں قبائلی رقابت کی بنا پر ان میں کیسی ہی معرکہ آرائیاں ہو چکی ہوں اور اس کے برعکس خاص اپنے عزیزوں قریبوں اور چہیتوں کو اللہ کے راستہ میں قتل کرنے پر آمادہ ہو جانا جن کی حمایت ومدافعت اسلام سے پہلے ان کی زندگی کا اولین فریضہ تھا، مختصر یہ کہ مختلف ومتضاد اخلاق وملکات میں یہ توازن واعتدال کیا سوائے اس جماعت کے کسی اور میں بھی پایا جا سکتا ہے جس کی قوتِ نظر وعمل کسی غیر معمولی اثر کے ماتحت نہایت معتدل ومہذب ہو چکی ہو، اور جس نے تمام انفرادیتوں کو یکقلم فراموش کرکے اپنے آپ کو ایک وجودِ اعلیٰ واشرف کے ساتھ وابستہ کر لیا ہو۔

اب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے حضرت علیؓ کے عہد تک خلافتِ راشدہ کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اوصاف وکمالات خلافتِ راشدہ کے عہد میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اس بنا پر عہدِ نبوت کو مستثنیٰ کرکے پوری تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ روشن اور عظیم الشان زمانہ یہی ہے۔ اسی زمانہ کا نظامِ حکومت حقیقی معنیٰ میں کسی حکومت کا بہترین نظام کہلا سکتا ہے چنانچہ اس عہدِ خلافت کے چند نمایاں اوصاف حسب ذیل ہیں۔

خلفاء کی سادگی خلفاء راشدین نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ظاہری نمود وشان کا ان میں پتہ نہ تھا خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ خلافت سے پہلے کسی لڑکی کی بکری کا دودھ دوھیا کرتے تھے۔ آپ خلیفہ ہوئے تو لڑکی بولی "اب ہمارا دودھ کون دوہیگا" حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنکر فرمایا "خلافت مجھکو خلقِ خدا کی خدمت سے

باز نہیں رکھ سکتی۔ حضرت عمرؓ جس سادگی سے رہتے تھے دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، شان یہ تھی کہ آپ کی فوجوں نے ایران کی ساسانی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے۔ قیصر و کسریٰ کے سامنے آپ کا نام آتا ہے تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ اور خالدؓ ایسے جرنیلوں سے باز پرس ہوتی ہے تو کیا مجال کہ ان میں سے کسی کی پیشانی پر ناراضگی یا عدول حکمی کی ایک شکن بھی پڑ سکے۔ لیکن اس شانِ جبروت و سطوت کے باوجود سادگی کا یہ عالم ہے کہ بدن پر پیوند لگا ہوا کرتا ہے، سر پر پھٹا پرانا عمامہ، اور پاؤں میں ایک بہت ہی معمولی جوتہ ہے۔ سفر میں اس جلیل القدر خلیفہ کو خیمہ و خرگاہ کی ضرورت نہیں چلتے چلتے جہاں نیند آئی وہیں کسی درخت کے سایہ میں پڑ گئے، مکان میں دربان اور خدم و حشم کا اہتمام نہیں ہے، جو شخص جس وقت چاہے بے تکلف آ کر مل سکتا اور اپنی ضرورت بیان کر سکتا ہے پھر خلافت کی ذمہ داری کا احساس اس قدر شدید ہے کہ خود غریبوں اور بیکسوں کی خبر گیری کرتے ہیں اور ضرورت ہوتی ہے تو ان کے گھروں کا کام بھی کر آتے ہیں خلیفہ ہونے کے باوصف انھیں گھر کا کام کرنے میں اور بازار سے سودا سلف لانے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ

> ایک مرتبہ حضرت علیؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں بازار تشریف لے گئے۔ اور ایک درہم کے پھل خرید کئے۔ انھیں کرتہ میں رکھکر خود ہی لا رہے تھے کہ راستہ میں کسی نے کہا ''امیر المومنین! اپنا بوجھ کسی کو دیدیجئے'' آپ نے جواب دیا ''ابو العیال احق بحملہ'' بال بچوں والا شخص اس بوجھ کے اٹھانے کا زیادہ سزاوار ہے'' [۵]

بیت المال کی حفاظت

اس بے غرضی، بے نفسی اور خلوص و للٰہیت کے باعث خلفاء راشدین بیت المال کے ایک ایک پیسہ کی حفاظت کرتے اور اس کے صرف کرنے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے، وہ اس کو حقیقۃً قوم کی امانت سمجھتے تھے اور اس بنا پر اس کا کوئی ایک پیسہ اپنی ذات یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے

---

[۵] ابنِ اثیر ج ۳ ص ۱۶۰۔

آرام و آسائش پر خرچ کرنے کو حرام جانتے تھے۔ جو خلفا بیت المال سے اپنی معاشی ضرورت کے لئے کچھ لیتے بھی تھے تو صرف اس قدر کہ اس سے زندگی کی ابتدائی ضرورتیں پوری ہو سکیں، چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ بیمار ہوئے، دوا میں شہد تجویز کیا گیا، بیت المال میں شہد موجود تھا ہی، لوگوں نے کہا اس میں سے لے لیجئے مگر آپ نے مسلمانوں کی اجازت کے بغیر اسے لینا گوارا نہ کیا، چنانچہ آپ نے مسجد نبوی میں تشریف لاکر مسلمانوں سے شہد کے استعمال کرنے کی باقاعدہ اجازت لی۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابو رافع حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بیت المال کے خزانچی تھے ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان کی صاحبزادی کو دیکھا کہ ایک موتی پہن رکھا ہے، یہ موتی بیت المال کا تھا حضرت علیؓ نے پوچھا "یہ کہاں سے آیا، میں یقیناً اس لڑکی کا ہاتھ کاٹونگا" ابو رافع نے یہ دیکھکر عرض کیا" امیر المومنین! بخدا میں نے خود یہ موتی اس کو دیا ہے ورنہ یہ کہاں سے لاسکتی تھی" حضرت علیؓ نے فرمایا" میں نے جب فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کیا تھا تو اس وقت میرے پاس بجز ایک مینڈھے کی کھال کے کوئی اور چیز نہیں تھی، ہم دونوں اسی پر سوتے تھے اور دن کے وقت اپنی اونٹنی کو اس پر گھاس دانہ کھلاتے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے سوا کوئی اور شخص میرا کام کرنیوالا بھی نہیں تھا۔"[۲]

جس طرح بیت المال کے خرچ کرنے میں حد سے زیادہ احتیاط برتی جاتی تھی، اسی طرح محاصل اور دوسری واجب رقوم کے وصول کرنے میں بھی اس بات کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی عامل کی طرف سے کوئی ناجائز تشدد یا سختی عمل میں نہ آئے۔ اور کوئی سرکاری عہدہ دار وصولیابی میں کسی پر ظلم نہ کرسکے۔

عدل و مساوات احکام و قوانین کے اجرا میں اپنے پرائے کا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا تھا جس کا وہ از روئے شریعت مستحق تھا۔ خاندانی قرابت یا کسی اور وجہ تقرب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ ابو شحمہ نے جب شراب پی تو آپ نے

---

[۱] طبقات ابن سعد حالات حضرت عمرؓ۔ [۲] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۵۹ و طبری ج ۶ ص ۹۰۔

خود اپنے ہاتھ سے ان کو کوڑے مارے جس کے صدمہ سے وہ قضا کر گئے۔[۵۱] قدامۃ بن مظعون جو حضرت عمرؓ کے سالے اور بڑے رتبہ کے صحابی تھے جب اسی جرم میں ماخوذ ہوئے تو علانیہ ان کو اسّی درے لگوائے"[۵۲] گورنرِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے متعلق جب ایک قبطی نے آکر ان کے ظلم و زیادتی کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے فوراً ان کو مصر سے طلب فرما کر سزا دی"[۵۳]

انتہا یہ ہے کہ اگر خلیفہ خود بھی کسی معاملہ میں مدعی ہوتا تھا تو وہ عام لوگوں کی طرح عدالت میں حاضر ہو کر اپنا مطالبہ پیش کرتا تھا اور قاضی خلیفہ کی شخصیت سے قطع نظر کر کے وہی فیصلہ کرتا تھا جو اُسے ازروئے شریعت دوسرے لوگوں کے حق میں کرنا چاہئے تھا، چنانچہ ایک دفعہ خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ گر پڑی کسی نصرانی نے اس کو اٹھا لیا۔ امیر المومنین نے قاضی شریح کی عدالت میں مرافعہ کیا، قاضی نے بحکم البیّنۃ للمدعی والیمین علیٰ من انکر" مدعی سے گواہ طلب کیا جائے گا اور منکر پر قسم آئیگی" حضرت علیؓ سے گواہ طلب کیے"۔ آپ نے فرمایا" میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے" قاضی شریح نے یہ سنکر فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیدیا"[۵۴]

حضرت عمرؓ کس جاہ و جلال کے خلیفہ تھے لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ ابی بن کعبؓ سے آپ کا نزاع ہو گیا۔ زید بن ثابت کے ہاں مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عمرؓ اس سلسلہ میں ان کے پاس گئے تو وہ تعظیماً کھڑے ہوگئے اور اپنی جگہ خالی کر دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم نے اس مقدمہ میں کی، یہ کہکر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

انتخابِ خلیفہ خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا تھا یعنی وہ لوگ انتخاب کرتے تھے جو مسلمانوں کے نمائندہ ہوتے تھے اور جن کی اصابتِ رائے و تدبیر پر سب کو اعتماد ہوتا تھا، یہ نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں ہی وہ اپنے بیٹے یا چچا بھتیجے کے لئے مسلمانوں سے بیعت لے لیتے ہوں یا ان کے خلیفہ منتخب ہونے کی سفارش

[۵۱] معارف ابن قتیبہ ص ۸۱ [۵۲] طبقات ابن سعد تذکرہ قدامۃ۔ [۵۳] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱ [۵۴] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۰۔

کرکے دنیا سے رخصت ہوتے ہوں۔

عمال کی نگرانی اور احتساب

خلفاء راشدین خود جس طرح زہد و قناعت، سادگی اور بے غرضی و بے نفسی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اس بات کی بھی شدید نگرانی کرتے تھے کہ عمال اور دوسرے عہدہ داران حکومت بھی اسی طور طریقہ پر زندگی بسر کریں، اول تو ان لوگوں کا انتخاب ہی بڑی احتیاط سے ہوتا تھا پھر انتخاب کے بعد ہر ایک سے ان امور کا عہد و پیمان لیا جاتا تھا کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیگا، دروازہ پر دربان نہ رکھیگا، اہلِ حاجت کے لئے اس کا دروازہ کھلا رہیگا۔[1] ہر عامل کی آمدنی اور اس کے اخراجات اور سامان وغیرہ کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی، چنانچہ اگر کسی عامل کا سامان یا اس کے اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ معلوم ہوتے تھے تو فوراً اس سے احتساب ہوتا تھا۔ اور نصف نصف پر مقاسمت ہو جاتی تھی چنانچہ فتوح البلدان میں اس قسم کے کئی واقعات مذکور ہیں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ عمال سے روانگی کے وقت جو کھانے پینے اور لباس کے متعلق عہد لیتے تھے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ عمدہ کھانے کھانا اور باریک لباس پہننا حضرت عمرؓ کے نزدیک ناجائز یا حرام تھا بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں میں جفاکشی کی عادت رہے، ان کی زندگی سپاہیانہ ہو اور سب کا طرزِ معاشرت یکساں نظر آئے، چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ کو سفید روٹی (غالباً میدہ کی) پیش کی گئی، آپ نے دریافت فرمایا "کیا سب مسلمان یہی کھاتے ہیں؟" جواب نفی میں ملا تو آپ نے فرمایا "بس تو اب ہم بھی اسے نہیں کھائیں گے۔"[2]

ایک مرتبہ عتبۃ بن فرقد اسلمی نے جو آذربیجان کے عامل تھے حضرت عمرؓ کی خدمت میں بعض خاص قسم کے حلوے کا غذوں میں لپیٹ کر بطورِ تحفہ ارسال کئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھکر فرمایا "اسے واپس کردو

---

[1] طبری ج ۵ ص ۲۱۔ [2] اسد الغابہ تذکرہ حضرت عمرؓ۔

اور ساتھ ہی عتبہ کو لکھا "تم اپنی اور اپنے باپ کی مشقت و محنت کے بغیر اس قسم کے حلوے کھاتے ہو؟ یاد رکھو ہم سوائے ان چیزوں کے کوئی اور چیز نہ کھائیں گے جن کو مسلمان اپنے اپنے گھروں میں شکم سیر ہو کر کھاتے ہوں۔" ؎

پھر تنہا خلفاء راشدین کی ذات پر ہی کیا موقوف ہے، یہ پوری جماعت جس نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے نور حاصل کیا تھا۔ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر دور میں اور ہر جماعت میں بڑی بڑی خوبیوں کے انسان پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ عرب کے بدوؤں جیسی غیر مہذب و ناشایستہ لوگوں میں سے یکایک ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہو جس کا ہر ہر فرد ذہنی و عملی محاسن کے آسمان کا آفتاب و ماہتاب بنکر چمکا ہو اور جس نے فکر و نظر اور عمل و اخلاق کے بہترین نمونے پیش کر کے اپنے انسانِ اعلیٰ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہو۔

اس مختصر گذارش سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اولین دور میں جو مسلمان جماعت پیدا ہوئی وہ چونکہ فکری اور نظری اعتبار سے عقیدۂ توحید پر ایمان صادق و راسخ رکھتی تھی اور پھر عملی لحاظ سے اس کے تمام کاموں میں، عبادات و معاملات میں، اخلاق اور عادات میں "اتقا" کی روح کارفرما تھی۔ اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ صالح جماعت تھی اور بقاءِ اصلح کے قانونِ فطری کے مطابق اس جماعت کو ہی حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہو کر رہے، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ احکم الحاکمین کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا۔

لَا تَھِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ تم سبکسر نہ ہو اور غم نہ کرو، تم تو بلند ہو۔

پھر ان کو اللہ نے خود اپنی جماعت قرار دیا اور ان کے لئے فلاح کا وعدہ فرمایا گیا۔ ارشاد ہے۔

اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ خبردار رہو کہ بے شبہ اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہوگا۔

؎ فتوح البلدان ص ۳۲۴۔

شاعرِ ملت اقبال نے کہا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس میں شبہ نہیں کہ یقینِ محکم اور عمل پیہم ہی دو ہتھیار ہیں جن سے کوئی قوم اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہو سکتی ہے لیکن جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں، یہ صرف فرزندانِ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ یقینِ محکم رکھتے ہیں لیکن کس چیز کا؟ نسلی، وطنی، یا عملی اعتبار سے دوسروں پر فائق ہونے کا نہیں بلکہ اس بات کا کہ

"خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے"

پھر یہ قوم عملِ پیہم بھی کرتی ہے تو اسی غالب تصور و ایمان کے زیر اثر، اس بنا پر یہ ظاہر ہے، کہ مسلمانوں کا "یقینِ محکم" اور ان کا "عمل پیہم" اپنے اندر ایک ایسی خصوصیتِ فائقہ رکھتا ہے کہ وہ عقیدۂ توحید اور اعمال میں "اتقاء" کی رعایت رکھے بغیر کسی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تیسری چیز جو اقبال نے بیان کی ہے وہ محبت ہے جس کو انھوں نے فاتحِ عالم کہا ہے، یقینِ محکم اور عمل پیہم کی طرح یہ "محبت" مسلمانوں کی طرح دوسری اقوام میں پائی جا سکتی ہے مگر مسلمانوں کی محبت بھی ان کے یقین و عمل کی طرح دوسری قوم کی محبت سے یکسر مختلف ہے، ان کی محبت کسی ذاتی حظِ نفس یا نفسی خواہش پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ خدا کے تعلق کے اعتبار سے اس محبت کی بنیاد انسانی اخوت کے احساس اور خلوص و للّٰہیت کے جذبہ پر قائم ہوتی ہے اسی محبت کو "حب فی اللہ" کہتے ہیں۔ اس محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کسی قوم سے اگر جنگ کرتے بھی ہیں تو چونکہ اس جنگ میں ہوسِ ملک گیری یا جذبۂ ملوکیت پسندی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت اور خالصۃً لوجہ اللہ اعلاء کلمۂ حق اس کا مقصد ہوتا ہے اس بنا پر یہ عام فاتحین عالم کی طرح مفتوح اقوام کے ساتھ ناگوار جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کرتے اور سختی کے ساتھ ان احکام کی پابندی کرتے ہیں جو اس بارہ میں ان کو خدا نے بتائے ہیں۔ اس صلح جویانہ روش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فریقِ مخالف اپنے ہنگامی یا جذباتی بغض و عناد کی عینک اتار کر جب ان کے اخلاق و اعمال اور ان کے

مقدس باطنی احساسات وجذبات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی عداوت محبت سے اور اس کا تنافر انسیت و الفت سے بدل جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان صرف کسی ملک کی زمین کو ہی فتح نہیں کرتے بلکہ اپنی للّٰہیت اور انسانی خیراندیشی وخیرسگالی کے باعث اہلِ ملک کے دلوں کو بھی مسخر کر لیتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ ایران کی جنگ میں ایرانی فوج کے چار ہزار سپاہی بیک وقت مسلمان ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی صف سے آملے، پھر یہ لوگ یونہی دکھاوے کے مسلمان نہیں تھے بلکہ ان کی جو تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ میں کام آتی تھیں اب ان کی حمایت واعانت میں کام آنے لگیں، چنانچہ یہ سب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے زیرِ علم مدائن اور جلولار کی جنگ میں شریک ہوئے اور اس معرکہ کو جیت کر سرخروئی حاصل کی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کو کون نہیں جانتا کہ اس نے سندھ میں دشمن کو کس بری طرح پامال کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے اسلامی اخلاق اور کیرکٹر سے مفتوحین کے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یزید بن ابی کبشہ السکسکی سندھ کا گورنر ہو کر آیا اور اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا تو اہلِ ہند زار وقطار روتے تھے اور انھوں نے یادگار کے طور پر محمد بن قاسم کی تصویر بنا کر کیرج میں رکھی۔"[1]

میں نے محبت کی یہ تشریح ضمناً ذکر آجانے کی وجہ سے کی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ "عقیدۂ توحید اور اتقاء" یہ دو بنیادی امور ہیں جن پر تمام فضائلِ اخلاق کی بنیاد قائم ہے انھیں فضائل اخلاق میں سے ایک محبت بھی ہے، فلسفۂ اخلاق میں "عدالت" کو جامع فضائل اخلاق کہتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدۂ توحید اور اتقاء ان دونوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان میں عدالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نظری اور عملی دونوں قسم کے کمالات و فضائل کا جامع بن جاتا ہے۔

اب اس وقت اس جماعت میں ایسی زبردست طاقت و قوت اور مصائب انگیزی و

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۸

جفاکشی کی ایسی جرأت و ہمت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسری جماعتیں اس کے سامنے سپر افگنی پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس جماعت کے غیر معمولی عزم و ارادہ کو دیکھکر شاہانہ جاہ و جلال کے باوصف ان کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ حضرت نعمان بن مُقرن کی سرکردگی میں سفرائے اسلام شہنشاہِ ایران یزدگرد کے دربار میں پہنچے تو اس وقت ایرانی رسم و رواج کے مطابق دربار اس شان و شوکت سے سجایا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، لیکن یہی سفرائے اسلام جب عربی جبے پہنے، کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے اور ہاتھوں میں کوڑے لئے اور موزے پہنے نہایت بے باکی اور حد درجہ شانِ استغنار کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے ایسی ہیبت ظاہر ہوتی تھی کہ شہنشاہِ ایران مرعوب ہوا جاتا تھا۔

ابورجار الفارسی کے دادا کا جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے بیان ہے کہ میں خود قادسیہ کی جنگ میں شریک تھا اور ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا، شروع شروع میں عربوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے کہا "یہ تیر کہاں ہیں، یہ تو تکلے ہیں" لیکن آخر کار انہی تکلوں نے ہمارا کام تمام کر کے رکھدیا۔ ہم ادھر سے جو تیر پھینکتے تھے وہ کسی مسلمان کے کپڑوں سے الجھکر رہ جاتا تھا لیکن مسلمانوں کی طرف سے جو تیر آتا تھا مضبوط سے مضبوط زرہوں اور ڈبل خودوں کو چیرتا ہوا باہر نکل جاتا تھا۔" ؎۱ه

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنئے۔ ایرانیوں کا شکست خوردہ لشکر قادسیہ سے بھاگ کر مدائن پہنچا۔ درمیان میں دریائے دجلہ پڑتا تھا، ایرانیوں نے دریا کو پار کرنے کے بعد تمام کشتیاں دریا سے الگ کرلیں اور پلوں کو آگ لگا دی تاکہ مسلمان دریا کو عبور کر کے ان کا تعاقب نہ کر سکیں، لیکن مسلمانوں نے دریا میں گھوڑے ڈالدیئے اور دریا کو پار کر گئے۔ اب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو آپس میں کہنے لگے "قسم خدا کی تم تو انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑ رہے ہو" ؎۵۲

اب بتائیے کیا یہ عزم و حوصلہ اخلاقی اور روحانی قوت و انبساط کے بغیر کسی قوم میں پیدا

؎۱ه فتوح البلدان ص ۲۶۰ - ؎۵۲ فتوح البلدان ص ۲۶۳ -

ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس ایمان و عمل کا یہی وہ مقام رفیع تھا جس پر صحابہ کرامؓ کی جماعت فائز تھی اور اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ شائستہ اور صالح جماعت تھی، اور بقاءِ اصلح کے فطری قانون کے مطابق اسی کو حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہو کر رہے، چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا! تاریخ کے صفحات ان کے شاندار کارناموں سے پر ہیں اور اس کی بنیاد وہی ہے جو میں نے بیان کی۔

آنحضرت صلعم کی پیشینگوئی

لیکن افسوس ہے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان دور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا اور رہتا بھی کس طرح؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زبانِ حق ترجمان سے فرما چکے تھے،

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم	میری امت میں سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس کے
ثم الذین یلونھم ثم ان بعدکم	بعد والوں کا، اور پھر اس کے بعد والوں کا، پھر تمہارے
قوماً یشھدون ولا یستشھدون	بعد ایک قوم آئیگی جو شہادت دیگی حالانکہ اس سے شہادت
ویخونون ولا یؤتمنون وینذرون	طلب نہ کی جائیگی یہ لوگ خائن ہوں گے امانتدار نہیں
ولا یفون ویظھر فیھم السمن۔	یہ نذریں مانیں گے مگر انھیں پورا نہیں کریں گے اور ان
(صحیح بخاری)	میں موٹاپا عام ہو جائیگا۔" [1]

[1] حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ نے طبرانی سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں ملک عضوض یا جبری سلطنت کے بعض نشانات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام میں شروع سے اب تک جو کچھ انقلابات ہوئے ہیں اور طریقِ حکومت کے اعتبار سے جو جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان سب کا اجمالی خاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی دکھلا دیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ان ھذا الامر بدا رحمۃ ونبوۃ، ثم	اس حکومت کا آغاز رحمت اور نبوت سے ہوا ہے پھر یہ رحمت
یکون رحمۃ وخلافۃ، ثم کائن ملکا	اور خلافت ہوگی اس کے بعد جبری سلطنت بن جائیگی پھر
عضوضا، ثم کائن عتوا وجبریۃ	یہ سرکشی تشدد اور فساد فی الارض میں تبدیل ہو جائیگی مسلمان
وفساداً فی الارض یستحلون الحریر	بادشاہ ریشم اور شراب کو حلال کر لینگے اور شہوت رانی میں

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اس پیشینگوئی میں یہ بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تین ادوار کو خیر فرمایا ہے لیکن خیر ہونے میں تینوں برابر کے درجہ کے نہیں کیونکہ عربی زبان میں کلمۂ ثُمَّ جس طرح تراخی زمانی پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اس سے تراخی فی المرتبۃ کا مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے، اس بنا پر اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا بہترین دور تو وہ ہوگا جس میں آنحضرتؐ جلوہ فرمائے عالم آب و گل ہوں گے اس کے بعد دورِ صحابہ بھی خیر القرون ہوگا، مگر عہدِ نبوت سے کم درجہ پر، اسی طرح عہدِ تابعین بھی خیر ہوگا لیکن اس میں عہدِ صحابہ کی سی بھلائی (خیریت) نہیں ہوگی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئینگے جن کو مسلمانوں کی بدنصیبیوں کی تاریخ کا پہلا باب کہا جائیگا اور اب اسلام کی حقیقی روح کا اضمحلال شروع ہو جائیگا۔ تابعین کے دور میں یہ اضمحلال اور بڑھیگا۔ لیکن ان دونوں زمانوں کا اضمحلال غیر محسوس ہوگا۔ اس لئے بحیثیتِ مجموعی آئندہ آنے والے زمانوں کی بہ نسبت یہ دور پھر بھی خیر القرون ہوں گے، تمثیلاً یوں سمجھئے کہ کسی چیز میں سپیدی کامل درجہ کی ہوتی ہے تو اس میں سیاہی کا بالکل نام و نشان نہیں ہوتا لیکن جب سپیدی گھٹنے لگتی ہے تو جس رفتار سے وہ کم ہوتی جاتی ہے اسی رفتار سے سپیدی کی ضد یعنی سیاہی بڑھتی رہتی ہے۔ اول اول یہ غیر محسوس ہوتی ہے لیکن آخر کار ایک وقت آتا ہے جب سیاہی اس تمام چیز پر محیط ہو جاتی ہے اور اب کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ یہ کبھی سپید بھی تھی، یا مثلاً عالمِ شباب گذرنے کے بعد قویٰ میں ضعف و انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے تو شروع میں اس درجہ غیر محسوس ہوتا ہے کہ کسی حاذق طبیب کے سوا کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا، پھر جب عہدِ شباب کا آفتاب لبِ بام آکر مطلعِ حیات پر شامِ پیری کی تاریکیاں بکھیر دیتا ہے اور کائناتِ عالم کی ہر چیز اداس و غمگین نظر آنے لگتی ہے تو انسان کو اپنے قویٰ کا انحطاط بین طور پر محسوس

(بقیہ ص۲۵) والفروج والخمور ویرزقون علی ذالک ویبصرون حتی یلقوا اللہ۔ مبتلا ہو جائیں گے ان کو اس کے مواقع ملیں گے یہاں تک کہ وہ خدا سے واصل ہو جائیں گے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۰)

ہوتا ہے اور اب اُسے تلافی مافات کی فکر ہوتی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشینگوئی کی تھی وہ ہو بہو پوری ہو کر رہی۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہر صحابی اپنی انفرادی زندگی میں ایمان و عمل کے آسمان کا آفتاب و ماہتاب' اور فرمانِ نبوی "ان میں سے تم جس کسی کا بھی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے" کا مصداق تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسلام کا وہ عدیم المثال اجتماعی نظام جو عہدِ نبوت اور اس کے بعد خلفاءِ ثلاثہ کے زمانوں میں قائم تھا حضرت عثمانؓ کے واقعۂ شہادت ۳۵ھ کے بعد اپنی اسی شکل و صورت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکا، خیر کے ساتھ شر لگا ہوتا ہی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی متعدد فتنے اٹھے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اپنی غیر معمولی فراستِ دینی شجاعت اور جرأت سے ان کا استیصال اس طرح کر دیا کہ ان کو پھر اُبھرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت

لیکن حضرت عثمانؓ کا واقعۂ شہادت اسلام کی تاریخ کا ایسا المناک حادثۂ فاجعہ ہے جس نے رونما ہو کر مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں لامرکزیت پیدا کر دی اور ایک ایسے فتنۂ عظیم کا دروازہ کھول دیا جس کی نحوستیں مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتی ہی رہیں، خلیفۂ سوم حضرت ذوالنورین کے شہید مظلوم ہونے میں کس بدبخت کو کلام ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر عثمانی حلم و سماحت کی جگہ دبدبۂ فاروقی کارفرما ہوتا تو صورتِ حال بالکل ہی دگرگوں ہوتی، پھر نہ عبداللہ بن سبا ایسے منافق کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہو سکتی تھیں اور نہ مصر و عراق کے بدباطن انسانوں کو خلافت کے برخلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی گستاخی کا حوصلہ ہو سکتا تھا، حضرت عثمانؓ نے جان دیدی مگر فتنہ کے کھڑا ہونے کے اندیشے سے کسی کو باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی، بہرحال جو کارکنانِ قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا تھا وہ پورا ہو کر رہا خلیفۂ سوم انتہائی بے دردی اور سفاکی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے، دو دن تک نعشِ مبارک بے گور و کفن پڑی رہی۔ خونِ شہادت میں نہائے ہوئے جسمِ مطہر کو غسل دینے کی کیا ضرورت تھی تیسرے دن چند آدمیوں نے جان ہتھیلی پہ رکھکر دفن کا انتظام کیا۔

حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت

حضرت عثمانؓ کے اس غیر معمولی ایثار کے باوجود ان کو جو اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ اور اسلام کے اجتماعی نظام کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا۔ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی بے نفسی اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ نے شروع میں خلافت کا بار سنبھالنے سے بہت انکار کیا اور فرماتے رہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں اور نہ مجھکو اس کی کوئی ضرورت ہے، تم جس کسی کو خلیفہ منتخب کرلوگے میں بھی اس پر راضی ہوجاؤنگا" حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر ان حضرات کی نمایندگی کررہے تھے، حضرت علیؓ کا انکار دیکھکر جب انھوں نے کہا کہ مدینہ میں آپ سے بڑھکر خلافت کا کوئی اور دوسرا شخص مستحق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا "ایسا نہ کرو، میں بہ نسبت امیر ہونے کے وزیر ہونے کی اچھی استعداد رکھتا ہوں" لیکن جب مدینہ کے اکابر صحابہؓ کو زیادہ اصرار ہوا تو آپ نے جمہور کی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے اس کو منظور فرمالیا۔ [1]

حضرت علیؓ کی جلالتِ شان، تقویٰ، دیانت اور خلوص وللّٰہیت میں چون وچرا کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ منافقین کی وسیسہ کاریوں اور بعض نئے مسلمانوں کی ناواقفیت کی بنا پر عراق اور شام میں جو اندرونی کشمکش پیدا ہوگئی تھی وہ نہایت نازک صورت اختیار کرچکی تھی اور اس کو فرو کرنے کے لئے جس غیر معمولی سیاسی تدبر اور حزم ودوراندیشی کی ضرورت تھی، حضرت علیؓ کی پاک نفسی، نیک باطنی، اور اخلاقی عظمت وبرتری اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تھی، آپ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ امیر معاویہؓ کو جو شام کے گورنر تھے اور وہاں اپنا بڑا رسوخ واثر رکھتے تھے معزول کرنے کا ارادہ کرلیا، مدینہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایسے جلیل القدر اور سیاست داں صحابہ تشریف رکھتے تھے انھوں نے حضرت علیؓ کو سمجھایا کہ اگر آپ امیر معاویہؓ کو شام کی گورنری سے الگ کرنا چاہتے ہی ہیں تو پہلے ان سے اپنی خلافت پر بیعت لے لیجئے، اغلب یہ ہے کہ وہ اس میں آپ کی

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۴۷۔

مخالفت نہیں کریں گے پھر آپ ان کو معزول کر سکتے ہیں ورنہ اگر آپ نے بیعت لینے سے پہلے ہی ان کو ولایتِ شام سے الگ کر دیا تو وہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے آپ کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیں گے اور امت میں تشتت پیدا ہو جائیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مغیرہ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں بزرگوں کی یہ رائے نہایت صائب اور درست تھی مگر نوشتۂ تقدیر پر کس کی مجال ہے کہ خطِ نسخ پھیر سکے۔

حضرت علیؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا اور کہا اس میں شک نہیں کہ دنیوی مصالح کے لحاظ سے آپ کے مشورہ کے مطابق مجھکو یہی کرنا چاہئے کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو ابھی ان کے عہدوں پر رہنے دوں، لیکن مجھکو ان کے جن حالات کا علم ہے ان کے پیشِ نظر حق اور دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ میں ان کو معزول کردوں، اگر انھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی تو خیر! ورنہ پھر میں تلوار سے کام لونگا۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ نے تو یہانتک فرمایا کہ اچھا اگر آپ کو اموی عمال کے عزل پر اتنا ہی اصرار ہے تو یہ کیجئے کہ سر دست امیر معاویہؓ کے معاملہ کو ملتوی رہنے دیجئے۔ ایک مرتبہ ان سے بیعت لے لیجئے، پھر کوئی فتنہ اٹھیگا تو میں دیکھ لونگا، لیکن حضرت علیؓ نے اسے بھی نہیں مانا اور صرف امیر معاویہؓ نہیں بلکہ اور دوسرے حضرات جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے مختلف جگھوں کے گورنر بنے چلے آرہے تھے ان سب کے نام عزل کا پروانہ بھیجدیا اور ان کی جگہ اپنے نئے نئے عمال مقرر کردیئے۔ اس سلسلہ میں عثمان بن حنیف کو بصرہ کا، عمارۃ بن شہاب کو کوفہ کا، عبید اللہ بن عباس کو یمن کا، قیس بن سعد کو مصر کا اور سہل بن حنیف کو شام کا عامل بنا دیا گیا، لیکن ان سب مقامات کی فضا اس درجہ مخالف تھی کہ لوگ حضرت علیؓ کے عمال سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ شام کو جاتے ہوئے سہل بن حنیف سے تبوک میں ایک جماعت کی ملاقات ہوئی، جنھوں نے پوچھا "آپ کون ہیں؟ انھوں نے کہا "میں امیر ہوں" لوگوں نے پوچھا "کس چیز کے؟ بولے "شام کا" اب ان لوگوں نے کہا "اگر آپ کو عثمان نے بھیجا ہے تو بسر و چشم، ورنہ اگر کسی اور نے آپ کا تقرر کیا ہے تو آپ

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۶۰۔

واپس چلے جائیے۔" سہل بن حنیف نے کہا "کیا جو کچھ ہو چکا ہے تمہیں اس کی خبر نہیں ہے" انھوں نے جواب دیا "کیوں نہیں" اس گفتگو کے بعد سہل بن حنیف واپس چلے آئے۔ اسی طرح عمارۃ بن شہاب کوفہ کے عامل بنا کر بھیجے گئے، راستہ میں زبالہ کے مقام پر ان سے طلیحۃ بن خویلد کی ملاقات ہوگئی۔ طلیحۃ نے کہا "تم واپس چلے جاؤ کیونکہ کوفہ کے لوگ اپنے امیر کے بدلہ میں کسی اور شخص کی امارت پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ اور اگر تم نے واپس جانے سے انکار کیا تو میں تمہاری گردن اڑا دونگا" عمارۃ کمزور طبیعت کے انسان تھے اُن پر اس گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ سیدھے حضرت علیؓ کے پاس واپس لوٹ آئے، یمن کا حال بھی یہی ہوا حضرت علیؓ نے یہاں کا عامل عبیداللہ بن عباس کو مقرر کیا تھا، ان کے یمن پہنچتے پہنچتے یعلی بن امیہ نے ٹیکس کی تمام رقمیں وصول کیں اور انھیں لیکر مکہ آگئے[۱]۔ اب حضرت علیؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ سے فرمایا "جس چیز سے میں تم کو ڈراتا تھا وہی ہو گئی، خیر! بہرحال اب جبکہ شدنی بات واقع ہو ہی گئی ہے تو اب اس کی تلافی کی صورت بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ اس کا قلع قمع کر دیا جائے اور جو فتنہ کہ سر اٹھا رہا ہے اس کو کچل کر رکھدیا جائے" اسی سلسلہ میں آپ نے فرمایا "جہاں تک مجھ سے ہو سکیگا میں ضبط سے کام لونگا۔ مگر جب معاملہ قابو سے باہر ہوتا ہوا دیکھونگا تو مجھکو لامحالہ تلوار اٹھانی پڑیگی، کیونکہ بیماری کا آخری علاج داغ لگانا ہے۔"

بات اگر یہیں تک رہتی تو معاملہ زیادہ نہ بگڑتا، حضرت علیؓ اس صورتِ حال پر بہت جلد قابو پا سکتے تھے، لیکن جب انھوں نے اپنے اصرار کے مطابق امیر معاویہ کے نام بھی معزولی کا حکم بھیجا اور ان سے اپنی خلافت پر بیعت طلب کی تو حضرت عبداللہ بن عباس اور مغیرۃ بن شعبہ کے اندیشہ کے مطابق صورتِ حال نہایت ہی نازک ہو گئی، اول تو امیر معاویہؓ بیس بائیس برس سے شام کے والی چلے آرہے تھے، یہاں کے لوگوں کے عادات و خصائل اور افتادِ مزاج سے اچھی طرح واقف تھے، پھر چونکہ خود بڑے فیاض طبع اور داد و دہش کے عادی تھے اس لئے اہلِ شام ان سے بہت مانوس تھے۔ ان لوگوں کو حضرت علیؓ کی مخالفت پر آمادہ کر دینے

---

[۱] یہی رقوم خطیرہ تھیں جو جنگ جمل کی تیاری میں حضرت علیؓ کے خلاف صرف کی گئیں۔

کے لئے یہی کچھ کم نہ تھا کہ خلیفۂ مظلوم کے انتقام کی دعوت نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگادی، پھر اسی سلسلہ میں جب امیر معاویہؓ نے جامع دمشق کے منبر پر آویزاں کرکے حضرت عثمانؓ کے خون آلود کرتہ کا اور ان کی جاں نثار بیوی حضرت نائلہ کی تین کٹی ہوئی انگلیوں کا مظاہرہ مجمع عام میں کیا تو حال یہ تھا کہ بوڑھے اور جوان انھیں دیکھ دیکھکر زار و قطار روتے تھے اور حلف کرتے تھے کہ جب تک خلیفۂ ثالث کے خون بے گناہ کا بدلہ نہیں لے لیا جائیگا وہ کسی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت نہیں کرینگے۔" جو قاصد حضرت علیؓ کا پیغام امیر معاویہؓ کے پاس لیکر گیا تھا اس نے شام سے واپس آکر جب یہ تمام ماجرا حضرت علیؓ کو سنایا تو آپ نے کہا "ایخدا! تو گواہ ہے کہ میں حضرت عثمانؓ کے خون سے بری الذمہ ہوں" امیر المومنین حضرت علیؓ نے یہ جو کچھ فرمایا اس کی صداقت میں کیا کلام ہوسکتا ہے مگر دشواری یہ تھی کہ ایک طرف انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مغیرۃ بن شعبہ کے مشورہ پر عمل نہ کرکے ایک بڑی فروگذاشت کی اور دوسری جانب محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی ایسے لوگوں کو جن پر حضرت عثمانؓ کے قتل کرنے یا اس جرم میں شریک ہونے کا الزام تھا، عہدے دیکر اپنی مخالف فضا کو اور زیادہ شدید کردیا۔

عجب بات یہ ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر اہل شام تو حضرت علیؓ کے مخالف تھے ہی، حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بڑے اصرار سے حضرت علیؓ کو بیعت خلافت لینے پر آمادہ کیا تھا اور کہا تھا "مانختار غیرک" "ہم آپ کے سوا کسی اور کو پسند ہی نہیں کرتے" وہ بھی مکہ معظمہ پہنچکر ام المومنین حضرت عائشہؓ کی جماعت میں شریک ہوگئے اور حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ حالانکہ حضرت طلحہ و زبیر مدینہ کے قیام کے باعث اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حضرت علیؓ کو کوئی دخل نہیں ہے اور وہ اس سے بالکل مبرّہ اور منزہ ہیں، مخالفت کے یہی دو مرکز تھے جہاں حضرت علیؓ کے مخالف جذبات پرورش پارہے تھے، اِدھر شام اور حجاز میں یہ ہورہا تھا اُدھر مصر میں یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے بعض لوگوں کے کہنے سننے سے

مصر کے گورنر قیس بن سعد کو معزول کر دیا جو درحقیقت حضرت علیؓ کے سچے خیر خواہ اور ان کے جاں نثار تھے اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو یہاں کا والی بنا کر بھیجدیا، حضرت علیؓ کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر والوں میں بھی آپ کی طرف سے بددلی پیدا ہوگئی اور یہاں کے لوگوں کی اکثریت امیر معاویہؓ کی ہمنوائی کرنے لگی۔ پھر اس پر مستزاد یہ ہوا کہ سنہ ۳۶ھ میں جنگِ جمل کے بعد یہ دیکھکر کہ متعدد فتنوں اور شر انگیز ہنگاموں کے پیدا ہو جانے کے باعث حرم نبوی مدینہ کی توہین ہوتی ہے آپ نے کوفہ کو اپنا دار الخلافت بنا لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ فعل بھی ان کے دوسرے اعمال وافعال کی طرح نیک نیتی اور پاک طینتی پر ہی مبنی تھا، لیکن سیاسی اعتبار سے اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ مدینہ میں جو اکابر صحابہ مقیم تھے آپ کی صلاح ومشورہ سے محروم ہو گئے اور کوفہ میں جن نو مسلم عجمیوں کی کثرت تھی وہ آپ کے ارد گرد رہنے لگے۔

حضرت علیؓ نے جو کچھ کیا اس کے لئے سب سے بڑا عذر یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود جیسے پاک باطن بے نفس اور متدین تھے ایسا ہی دوسروں کو سمجھتے تھے اور ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ لوگ اپنی ذاتی منفعتوں سے صرف نظر کر کے دربارِ خلافت کے احکام کو بے چون وچرا بجا لائیں گے، اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ گمان ذاتی طور پر ان کے فضائل مآب ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیاستِ مدن میں ایسے بہت سے مراحل آتے ہیں جبکہ یہ حسنِ ظن مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر اگر اس حسنِ ظن کے ساتھ حضرت عمرؓ کا سا دبدبہ بھی ہوتا تو بات کچھ زیادہ نہ بگڑتی حضرت علیؓ بجبر اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتے تھے اور اگر کوئی فتنہ کھڑا ہوتا تو اس کی روک تھام پوری قوت سے کامیابی کے ساتھ کر سکتے تھے مگر افسوس ہے کہ یہاں صورت حال یہ بھی نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ جیسے ہر دلعزیز اسلامی جرنیل کو معزول کیا تو کسی کو اس حکم کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ اور فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کی گورنری سے الگ کیا تو کسی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی، لیکن حضرت علیؓ نے امیرِ معاویہؓ کے نام شام کی گورنری سے معزول ہونے کا پروانہ بھیجا

تو تمام اہلِ شام میں آگ سی لگ گئی اور حضرت علیؓ کے خلاف مخالفت کا ایک شدید طوفان امنڈ پڑا۔

حضرت علیؓ کی مخالفت

اس تمام مخالفت کی بنیاد صرف اس بات پر قائم تھی کہ حضرت علیؓ قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص لینے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے، کیوں کامیاب نہیں ہوسکے؟ یہاں اس کے ذکر کرنے کا موقع نہیں ہے مگر واقعہ یہی ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی امیر کی سیاسی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور اس کے احکام کو بے تامل بجالائیں، عراق کے جو لوگ حضرت علیؓ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی سچے دل سے حضرت علیؓ کے ساتھی اور ان کے مددگار نہیں تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"میں جب تم سے موسم سرما میں کہتا ہوں کہ شام والوں سے جنگ کرو تو تم کہتے ہو یہ تو بڑا سخت موسم ہے کڑاکے کا جاڑہ پڑ رہا ہے مگر جب موسم گرما میں کہتا ہوں کہ اچھا اب ان لوگوں سے لڑو تو تم کہنے لگتے ہو کہ آج کل تو بڑی ہی سخت گرمی ہو رہی ہے، گرم ہواؤں کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ علی کو سیاست ہی نہیں آتی، ہاں ٹھیک ہے جس شخص کی اطاعت نہیں کی جاتی اس کو سیاست بھی نہیں آتی۔"

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت حالات کس قدر پیچیدہ ہوچکے تھے، ایک طرف شام، مصر اور حجاز کے لوگ تھے جن کی اکثریت کھلم کھلا حضرت علیؓ کی مخالفت پر کمربستہ تھی اور دوسری جانب جو جماعت حضرت علیؓ کی حامی تھی اس میں بھی آپ کی حمایت و اعانت کا پورا جوش اور ولولہ نہیں تھا، لیکن چونکہ آپ خلیفہ منتخب ہوچکے تھے اور آپ کا یہ انتخاب بالکل حق بجانب اور درست تھا۔ اس بنا پر آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا کہ جو لوگ دربارِ خلافت کے احکام کی تعمیل نہ کریں ان کو سزا دی جائے حضرت علیؓ کے سیاسی تدبر میں کسی کو کلام ہو تو ہو لیکن ان کی بہادری میں کسی کو کیا مجالِ گفتگو ہوسکتی ہے؟ آخر کار اس کشمکش کا نتیجہ جنگِ جمل و صفین کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسلام کے وہ بہادر سپاہی جنھوں نے دوش بدوش کھڑے ہو کر بدر اور

حنین کے معرکوں میں کفر و شرک کی طاغوتی قوتوں کو شکستِ فاش دی تھی اب وہ خود آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تیغ آزمائی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امیر معاویہؓ کا طرزِ عمل

لیکن یہ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار صرف حضرت علیؓ کی ذات کو قرار نہیں دیا جا سکتا، امیر معاویہ مشہور مدبر اور صاحبِ سیاست بزرگ تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اسلام کی بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں، انھوں نے ہی طرابلس الشام کو فتح کیا اس کے علاوہ شام کے تمام سرحدی علاقوں پر قبضہ حاصل کر کے شام کو رومیوں کی دستبرد سے محفوظ بنا دیا حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کی اجازت لیکر ایک بحری بیڑا تیار کیا اور بحرِ روم کے مشہور جزیرہ قبرص (سائپرس) کو فتح کیا، یہ بحری بیڑا اتنا طاقتور اور مضبوط تھا کہ اس کے باعث مسلمان رومیوں کے بحری حملہ سے مامون ہو گئے۔ ان فتوحات کے علاوہ وہ چونکہ انتہا درجہ کے بیدار مغز اور ہوشیار تھے اس لئے تمام اندرونی اور بیرونی شورشوں اور سازشوں سے باخبر رہتے تھے، اس بنا پر انھوں نے بہت سی سازشوں کو ظاہر ہونے سے پہلے ہی ناکام کر دیا لیکن ان تمام فضائل کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کی خلافت کو ناکام کرنے کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ کم از کم ان جیسی بزرگ شخصیت سے متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر ان میں حضرت عثمانؓ کے قصاص لینے کا ایسا ہی جذبہ تھا تو وہ یہ کام حضرت علیؓ کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کر کے بھی انجام دے سکتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اکابر صحابہ کی جانیں ضائع ہوئیں، امت میں نفرتے پیدا ہو گئے، اسلام کا اجتماعی نظام درہم و برہم ہو کر رہ گیا، مگر حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ پھر بھی نہ لیا جا سکا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انتخابِ خلیفہ کے معاملہ میں مہاجرین و انصار میں جو شدید اختلاف پیدا ہوا تھا اور اس وقت حضرت عمرؓ نے موقع کی نزاکت کو محسوس فرما کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جس طرح اس قضیۂ نامرضیہ کو ختم کر دیا تھا۔ اگر اس وقت حضرت معاویہؓ بھی ایسا ہی طرزِ عمل

اختیار کرتے تو بے شبہ امتِ مرحومہ ایک عظیم فتنہ سے بچ جاتی اور وہ رخنے پیدا نہ ہوتے جو اب پیدا ہوئے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کا اپنی خلافت پر اصرار کرنا ایک ایسی بات ہے جس کو اسلام کی کوئی اچھی خدمت نہیں کہا جا سکتا۔

تحکیم کا معاملہ

چنانچہ اس کا ثبوت واقعۂ تحکیم سے بھی ملتا ہے، تحکیم کی پیش کش امیر معاویہؓ کی ہی طرف سے ہوئی تھی جب انھوں نے دیکھا کہ لیلۃ الھریر کی جنگ میں حضرت علیؓ کو کامیابی ہو چکی ہے تو عمرو بن العاص نے کہا "میں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں جس کی وجہ سے علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ جائیگی اور ہم سب کا اس میں بھلا ہوگا" امیر معاویہؓ نے پوچھا "وہ کونسی ترکیب ہے" عمرو بن العاص بولے وہ یہ ہے کہ ہم نیزوں پر قرآن مجید اٹھا کر اہلِ عراق کو دعوت دیں کہ یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ تم اس فریب میں نہ آنا میں ان لوگوں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن عراقیوں کی ایک بڑی جماعت اس فریب میں آچکی تھی، اس نے حضرت علیؓ کو مجبور کرکے قرآن مجید کو حکم ماننے پر مجبور کر دیا اب جنگ ملتوی ہو گئی اور یہ طے پایا کہ امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ایک ایک نمائندہ منتخب کیا جائے اور یہ دونوں نمایندے جو فیصلہ کر دیں اس کی پابندی سختی کے ساتھ کی جائے ان مشیرانِ کار نے یہ بھی کہا کہ حضرت علیؓ اس تجویز کو قبول کریں یا رد فرمائیں بہر حال ہمارا فائدہ ہوگا۔[۱]

ان الفاظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تحکیم کی تجویز کو پیش کر رہے تھے ان کی نیتوں میں خلوص نہیں تھا اور وہ وقتی طور پر اس بہانہ اپنا کام نکالنا چاہتے تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ تحکیم کی پیش کش جو اب تقریباً ستر ہزار فرزندانِ اسلام کی لاشوں کے خاک و خوں میں تڑپنے کے بعد کی جا رہی ہے نیک نیتی پر نہیں بلکہ خدع و فریب پر مبنی ہے مگر مشکل یہ تھی کہ عمرو بن العاص کی توقع کے مطابق اب خود عراقیوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی اس لئے

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۶۔

حضرت علیؓ کے سامنے اس کو قبول کر لینے کے سوا کوئی اور چارۂ کار تھا ہی کیا مگر جو اقدام کسی غرض اور ذاتی منفعت کے پیشِ نظر کیا گیا ہو، اس میں اجتماعی خیر و برکت کی توقع کس حد تک ہو سکتی ہے؟ نتیجہ اس کا بھی اسلام کے حق میں نہایت خطرناک نکلا جس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ اب تک مسلمانوں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے حامیوں کی دو جماعتیں تھیں۔ اب خوارج کے نام سے ایک اور فرقہ پیدا ہو گیا جو دونوں کا شدید مخالف اور دشمن تھا۔

اب ذرا تصور کیجئے، حضرت علیؓ کو ناکام کرنے کی ایک تدبیر (تحکیم) نے جو فاتح اجنادین عمرو بن العاص کے دماغ نے سوچی تھی کس طرح امت میں چند در چند فتنوں اور رخنوں کے پیدا ہونے کا سبب ہوئی! خوارج کا ظہور بھی اُسی کا ایک شاخسانہ تھا۔ اس فرقہ کے عناصر پہلے سے موجود تھے، لیکن ان کو ابھرنے اور منظم ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب ان سب نے ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک مستقل اور نہایت خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ نہروان کا مقام اس فرقہ کی کوششوں کا خاص آماجگاہ تھا حضرت علیؓ نے خطرہ کا احساس کر کے اس فرقۂ طاغیہ سے قتال کیا اور شکستِ فاش دیکر اس کے کس بل نکال دیئے۔

خوارج کی منظم کوششیں پریشان ہو چکی تھیں اب ان کے بچے کھچے لوگوں نے حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تینوں کو قتل کر دینے کی ایک مکمل سازش کی۔ عمرو بن العاصؓ حسنِ اتفاق سے بچ نکلے، امیر معاویہؓ زخمی ہوئے مگر علاج معالجہ کے بعد اچھے ہو گئے، اب رہے امیر المومنین حضرت علیؓ وہ دو خارجیوں کے ہاتھوں ایسے شدید زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور آخر کار علم و عمل کا یہ سراجِ منیر اور خلافتِ راشدہ کا آخری کوکبِ رخشاں رمضان ۴۰ھ میں اس عالمِ خاک و باد کو الوداع کہہ گیا۔

حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت پر تبصرہ

حضرت علیؓ کا عہدِ حکومت کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اگر اس پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کا طرزِ حکومت خلافتِ راشدہ کے منہاج پر تھا، ان کا انتخاب خود ان کی خواہش کے بغیر ہوا، اور ان مہاجرین و انصار نے انتخاب کیا جنھوں نے

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر آپ کا عام رویہ صلح جویانہ تھا کسی کے ساتھ غیر شرعی جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس وقت بعض منافقوں کی کوششوں سے حالات اس قدر پیچیدہ ہوگئے تھے کہ آپ ان کے سلجھانے میں باحسن وجوہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ لیکن آپ کے طرزِ حکومت میں ملوکیت کا ذرہ برابر شائبہ نہیں تھا، انھوں نے اپنی زندگی اسی تقویٰ طہارت اور سادگی و بے نفسی کے ساتھ بسر کی جو ان کے پیشرو خلفاء کا شعارِ خصوصی تھا یہانتک کہ وفات کے وقت آپ کے بعد حضرت حسنؓ کے انتخاب کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے اثبات و نفی میں کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اربابِ رائے پر ہی اس معاملہ کو چھوڑ دیا، آپ کے عہدِ حکومت میں ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ نے کسی موقع پر بھی "ڈپلومیٹک پالیسی" سے کام لیا ہو، آپ کا ظاہر و باطن ایک تھا جو دل میں ہوتا تھا زبان سے اسی کا اظہار فرماتے تھے اور جو زبان سے کہتے تھے وہی دل میں ہوتا تھا، آپ نے منصبِ خلافت سے اپنی ذات کے لئے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لئے کوئی ناجائز منفعت کبھی حاصل نہیں کی۔ آپ پر خشیتِ ربانی اور خوفِ خدا کا پورا غلبہ تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی شک نہیں کہ آپ کی خلافت خلافتِ راشدہ اور اسلام کے "آئیڈیل طرزِ حکومت" کی حامل تھی۔

• دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں ایک یہ کہ خلیفۂ وقت خود کن اخلاق و صفات کا حامل ہے اور وہ اپنی حکومت کو کس نظام کے ماتحت چلانا چاہتا ہے اور دوسری یہ کہ اس کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی؟ جہانتک پہلی چیز کا تعلق ہے ابھی معلوم ہوچکا ہے کہ اس بارہ میں حضرت علیؓ پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ البتہ ہاں! اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت اس اعتبار سے ناکام ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے جمہوری نظام کو چلانے میں کامیاب نہیں ہوسکے، اس ناکامی کے وجوہ و اسباب مختصراً حسب ذیل ہیں۔

حضرت علیؓ کی ناکامی کے اسباب قبائلی عصبیت کا ظہور (۱) مجھکو صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان اسباب

ہیں سب سے بڑی وجہ قبائلی اور خاندانی عصبیت کا ظہور ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہے کہ یہ عصبیت جاہلیہ ہی ایک ایسا زہر ہے جو کسی قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے اس کی تمام اخلاقی اور عملی قوتوں کو کمزور یا ان کو حد سے زیادہ غیر معتدل بنا دیتا ہے، جب یہ زہر تدریجی طور پر ترقی کرتے کرتے کسی قوم کے دل اور دماغ پر پوری طرح مسلط ہو جاتا ہے تو اس قوم پر ایک ایسی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ انسانیت، جمہوریت اور عام رواداری کے تمام مقتضیات کو پسِ پشت ڈالکر وحشیانہ اعمال و افعال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی، اس میں اپنی برتری اور تفوق کا احساس اس درجہ قوی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس جذبہ پنہاں کی تسکین کے لئے جائز اور ناجائز کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھتی، اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ کوئی بین الاقوامی اجتماعی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عصبیت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر نہ پھینکدیا جائے، اور خاندانی و قبائلی برتری کے احساس کی جگہ عام مساوات و اخوت انسانی کا اذعان و یقین کامل طور پر پیدا نہ کر دیا جائے۔

اسلام میں عصبیتِ جاہلیت کی شدید مذمت

عرب کا ملک اس زہر سے سب سے زیادہ مسموم تھا، اس بنا پر یہاں آئے دن قتل و خونریزی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا، یہ لوگ غیر عربی قوموں کے ساتھ تو کسی وفاقی نظام کے ماتحت کیا جمع ہوتے، خود آپس میں ایک دوسرے کے تعاون و اشتراک سے کوئی قابلِ ذکر عرب اسٹیٹ قائم نہیں کر سکتے تھے پھر جب اسلام آیا تو عقیدۂ توحید کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ جاہلانہ تعصبات و حمیات سے الگ ہو کر ایک مرکز پر جمع ہو گئے اور جو پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اب شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ عصبیتِ جاہلیہ کی شرانگیزی اور ذمیمت کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تو چونکہ دنیا کو آپ اپنا ایک آخری پیغام دے رہے تھے اس لئے ظاہر ہے آپ بہت ہی اہم اور ضروری باتوں کا ذکر فرما سکتے تھے۔ آپ نے اس خطبہ میں جہاں دین کے اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی، ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کو عصبیتِ جاہلیت سے

بچے رہنے کی تلقین وتاکید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فان دماءکم واموالکم واعراضکم	پس تحقیق تمہارے خون، مال اور آبروئیں تم پر ایسی ہی واجب
علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔	الحرمت ہیں جیسا کہ آج کا دن لائق حرمت ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وستلقون ربکم فیسألکم عن	اور تم عنقریب اپنے رب سے ملوگے تو وہ تم سے تمہارے
اعمالکم الافلا ترجعوا بعدی	اعمال کی نسبت دریافت کریگا، خبردار رہو کہ میرے
ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض	بعد تم گمراہ مت ہوجانا کہ تم آپس میں ایک دوسرے
(بخاری باب حجۃ الوداع)	کی گردن مارنے لگو۔

صحیحین کی ہی ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ ہیں۔

الا کل شیٔ من امر الجاھلیۃ	یاد رکھو جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں
تحت قدمی موضوع۔	کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔

نسب وحسب کے، رنگ وروپ کے اور دولت وغربت کے جتنے امتیازات تھے اور جو ہمیشہ دنیا میں شر وفساد اور بے چینی وبدامنی کا سبب بنے ہیں ان سب کو یکقلم ختم کردینے کا حتمی اور قطعی اعلان فرمادیا گیا، ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا۔

ان اللہ اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ	بے شبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا حصہ اور آباء و
وفخرھا بالآباء۔ انما ھو مومن	اجداد پر فخر کرنے کی عادت کو دور کردیا ہے اب دنیا
تقی وفاجر شقی الناس کلھم	میں صرف دو ہی قسم کے آدمی ہوں گے ایک پرہیزگار مومن
بنو آدم وآدم خلق من	دوسرے بدنصیب کافر، تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں
تراب۔	اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

ہجرت مدینہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں جو مواخاۃ کرائی تھی وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کی نسبت جو ارشاد فرمایا تھا۔

سلمانُ منا اھل البیت۔ سلمان تو ہمارے ہی گھر کا ایک فرد ہے۔

تو اس سے بھی غرض یہی تھی کہ مسلمان عربیت اور عجمیت کے امتیاز کو بالکل فراموش کردیں یہی وجہ ہے کہ چونکہ عصبیت جاہلیت انسانوں کے اجتماعی نظام کی تکمیل کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، اس لئے جب اسلام نے اس سنگِ گراں کو دور کرکے عام اخوت اور مساوات کا جذبہ پیدا کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے حق میں اپنی ایک رحمت خاص بتاکر اس کا احسان جتایا چنانچہ ارشاد ہے۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ اور تم خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کے لطف وکرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

پھر اس کام کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرماتا ہے کہ محمدؐ! لوگوں کو جوڑ دینا تمہارا کام نہ تھا بلکہ اس میں خود خدائے مقلب القلوب کا ہاتھ کام کررہا تھا۔

ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعًا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم۔ وہ وہی خدا ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعہ آپ کی تائید کی، اور مسلمانوں کے دلوں میں اسی نے باہمی الفت پیدا کی اور اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کردیتے جو زمین میں ہے تب بھی مسلمانوں کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا، بے شبہ بڑی طاقت اور حکمت والا ہے۔

مراتبِ ایمانی کا تفاوت عصبیت جاہلیت کی ہلاکت آفرینی اور اسلام میں اس کی شدید مذمت کو معلوم

کرنے کے بعد اب ذرا اس پر غور کیجیے کہ قطع نظر اس بحث سے جو ائمۂ محدثین نے الایمان یزید وینقص کے باب میں کی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان جس اذعانی کیفیت کا نام ہے اس میں اشتداد وضعف دونوں کی استعداد ہوتی ہے اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آجکل مسلمان مسلمان سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ مراتبِ ایمانی میں متفاوت ہوتے ہیں اسی طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس مرتبہ میں یکساں اور برابر کے درجہ کے نہیں تھے خود اپنی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیت، افتادِ طبع اور سب سے بڑھکر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت کی زیادتی اور کمی کے باعث ان برگزیدہ ہستیوں میں بھی باہمی فرق و امتیاز تھا۔

امیرِ معاویہؓ کی مثال

تمثیلاً حضرت معاویہؓ کو ہی لیجیے۔ ان کی شان میں کسی غیر صحابی کو گفتگو کرنے کی کیا مجال ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ چونکہ فتح مکہ کے بعد اپنے والد ماجد ابوسفیان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے اس لئے آپ کو خلفاءِ اربعہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت و رسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں مثلاً سیاسی تدبر، استقامت و استقلال اور شہامت و شجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جلا ہوگئی اور ان قوتوں کا مصرف بدل گیا، تاہم بنو امیہ اور بنو ہاشم میں جو باہمی رقابت مدت سے چلی آرہی تھی امیر معاویہؓ کو اس سے خالی الذہن نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس میں دوسرے عوامل و اسباب کی طرح اس رجحان کو بھی بڑا دخل ہے ممکن ہے حضرت علیؓ پر بھی یہ شبہ کیا جائے لیکن یہ پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کو خاندانی رقابت کے زیرِ اثر اور اسلام کی تعلیمات یا اس کی روح کے خلاف کہا جائے، اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہ بہادری عالی حوصلگی دریا دلی اور سیاسی تدبر کے لحاظ سے ہم عصروں میں ممتاز تھے لیکن جب انھوں نے اپنی ان قوتوں سے کفر کے

مقابلہ میں کام لیا تو ایسے شاندار کارنامے کئے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو ان پر ناز ہو سکتا ہے، لیکن جب ان کی یہی قوتیں اموی خاندان کی جڑیں مضبوط کرنے میں صرف ہونی شروع ہوئیں تو اس سے ایک ایسے طریقِ حکومت کی تشکیل ہوئی جس کو خلافتِ راشدہ کے منہاج پر نہیں کہا جا سکتا اور رسولِ صادق وامین کی یہ پیشینگوئی کہ "اے مسلمانو! نبوت کے بعد تم میں خلافت علیٰ منہاج النبوت ہوگی اور جب تک خدا چاہیگا وہ رہیگی، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لیگا اور اس کے بعد "ملکِ عاض" (جابرانہ سلطنت) کا رواج ہوگا۔"
(مسند امام احمد بن حنبل) پوری ہوئی۔

عجمی مسلمانوں کے اثرات

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی فتوحات کے باعث عجمی قوموں کے جو لوگ مسلمان ہو ہو کر عرب مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے تھے وہ چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور مسلمانوں کی اندرونی کشمکش کے باعث ان کو صحیح اسلامی تربیت کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا اس بنا پر اسلام کی حقیقی روح ان کے دل و دماغ میں سرایت نہیں کر سکی تھی اور عہدِ جاہلیت کے اطوار و طرق کا کچھ کچھ اثر اب بھی ان کی زندگیوں میں محسوس ہوتا تھا۔ ادھر سبائیوں کا گروہ "دین از مسلمانوں کے بھیس میں برابر اپنی ذلیل تگ و دو میں مصروف تھا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو مسموم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور انبیاء کرام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ ان دونوں طبقوں کے ساتھ میل جول کا یہ اثر ہوا کہ چند مواقع پر بڑے بڑے راسخ العقیدہ مسلمانوں سے بھی شدید لغزشیں سرزد ہو گئیں اور وہ ان خطرات کا احساس نہیں کر سکے جو ان کے طرزِ عمل سے پیدا ہو سکتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس کا احساس پہلے سے تھا اس بنا پر وہ مختلف عمال و حکام کو وقتاً فوقتاً ایسی ہدایات دیتے رہتے تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے اسلام اپنی مخصوص سادہ فطرت پر قائم رہے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اے کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کی دیوار حائل ہوتی۔"

اکابر صحابہ کی گوشہ نشینی

ان وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں اختلاف و انشقاق کا جو فتنہ برپا ہوا اس کو زیادہ

ابھرنے اور پھیلنے کا موقع اس لئے بھی ملا کہ بعض ارباب رسوخ واثر صحابۂ کرام جو عہد نبوت اور اس کے بعد
خلفاء ثلاثہ کے مبارک زمانوں میں عملی طور پر بڑے شاندار کارنامے انجام دے چکے تھے وہ ان شرور وفتن کو دیکھ کر
گوشہ نشین ہوگئے تھے گویا پبلک زندگی سے انھوں نے اپنا تعلق منقطع کرلیا تھا اور اب میدان پر صرف ان
لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنے ہاتھ میں تھوڑی بہت طاقت رکھتے تھے چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی نسبت مشہور
ہے کہ جب واقعۂ تحکیم میں انھوں نے جناب عمرو بن العاص کا طرزِ عمل دیکھا تو انھیں اس کا اتنا شدید صدمہ اور
رنج ہوا کہ وہ تمام سیاسی کاموں سے کنارہ کش ہوکر ایک گاؤں میں جا بسے اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے
حضرت عائشہؓ جنگ جمل کے سلسلہ میں مدینہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہونے لگیں تو اہلِ کوفہ کو اس کا اس درجہ
رنج ہوا کہ وہ زار وقطار روتے اور آہ وبکا کرتے تھے، یہانتک کہ اس دن کا نام ہی یوم النحیب (روزِ گریہ) پڑ گیا
حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے وہ ام المومنین کی اس دعوت پر شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے
الگ تھلگ رہنے کو ہی خیر سمجھا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ جانے کا قصد رکھتی تھیں لیکن
ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو سمجھا یا اور قسم دیکر انھیں بصرہ جانے سے روکا، غرض یہ ہے کہ یہ
حضرات اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اب اسلام میں فتنہ کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے، اس کا درد وہ اپنے
دل میں محسوس کرتے اور اس پر اشکباری کرتے تھے پھر زبان سے وعظ ونصیحت میں اور ارشاد وتلقین میں بھی انھوں
نے کوئی فروگذاشت نہیں کی لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ وہ حضرات تھے جو اس وقت سیاسی طاقت نہیں رکھتے تھے
مختلف ادارے اور عہدے دوسرے لوگوں کے قبضہ میں تھے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اربابِ خیر وتقویٰ
کی آواز صدا بہ صحرا یا نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہوکر رہ گئی اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

لمثل ھذا یذوب القلب من کمدٍ ان کان فی القلب سلامٌ وایمانٌ

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے، یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ امت کا زوال اس وقت
شروع ہوگیا تھا لیکن پھر بھی ارشاد نبوی کے مطابق یہ زمانہ خیر القرون تھا، بڑی بات تو یہ تھی کہ اکابر صحابہؓ

موجود تھے جنھوں نے ایک عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس وقت سیاسی اعتبار سے ان کا اثر خواہ کچھ زیادہ نمایاں نہ ہو لیکن وعظ و نصیحت، درس و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا چشمۂ فیض ان بزرگوں کے نفوسِ قدسیہ کی بدولت برابر جاری تھا اور اس کا اثر یہ تھا کہ انفرادی زندگی میں کسی کو ارتکاب منہیات و معصیات کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، کسی گورنر یا حاکم سے کوئی ظالمانہ فعل سرزد ہوتا بھی تھا تو وہ اس کے لئے قرآن و حدیث سے ہی کوئی سندِ اعتذار تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا، یہ حضرات آپس میں کیسے ہی لڑتے ہوں لیکن کفر کے مقابلے میں اپنے سب اختلافات بھول کر ایک ہو جاتے تھے، اس بنا پر اس وقت بھی ان کی ترقی اور فتوحات کا قدم رکا نہیں بلکہ وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ دینِ قیم کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بنو امیّہ کا عہد

سنہ ۴۱ھ میں خلافتِ راشدہ کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر عام بیعت ہوئی تو اس دن سے بنو امیہ کا عہد حکومت شروع ہوا، یہ عہد اپنے دامن میں امتِ مرحومہ کے عروج و زوال کی متعدد داستانیں رکھتا ہے، امیر معاویہؓ اس خاندان کے پہلے خلیفہ تھے، آپ کی خلافت سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۶۰ھ تک یعنی تقریباً بیس سال رہی جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آپ کی خلافت نہ خلافتِ راشدہ تھی اور نہ آپ خلیفہ راشد تھے، لیکن اس کے باوجود تھوڑا بہت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھائے ہوئے تھے، صحابی تھے اور کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے اس لئے متعدد غلطیوں کے باوجود آپ کا دل خشیتِ ربانی اور اسلام کی ترقی و عروج کی حقیقی تڑپ سے خالی نہ تھا، چنانچہ طبری میں ہے کہ ایک مرتبہ شام کے کسی مقام پر ٹھیرے ہوئے تھے، سامنے سے آپ کے جاہ و حشم کا سامان گھوڑے، کنیزیں اور گاڑیاں گذریں تو آپ انھیں دیکھ کر شرمسار ہو گئے اور ابن مسعدہ سے فرمانے لگے جو اس وقت آپ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے " اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے نہ انھوں نے دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے ان کا ارادہ کیا، عمرؓ کو دنیا نے تو بہت چاہا مگر خود انھوں نے اس کا کبھی ارادہ نہیں فرمایا، رہے عثمانؓ تو ان کو دنیا سے کچھ ملا اور دنیا نے ان سے بھی کچھ حاصل کیا۔ ان کے بعد ہم تو دنیا

میں لت پت ہی ہو گئے۔" ؎۱

اس ذاتی خوبی کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ نے اس زمانہ کے نازک اور پیچیدہ حالات میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو مضبوط اور محفوظ بنانے میں جس سیاسی تدبر، دور اندیشی اور موقع شناسی کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے فضائل میں سر فہرست بننے کے لائق ہے۔

شمالی افریقہ کا بڑا حصہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ہی فتح ہو چکا تھا، امیر معاویہؓ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا، یہاں کے بربریوں نے سرکش ہو کر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، امیر معاویہ نے اس بغاوت کا قلع قمع کر کے یہاں مسلمانوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا، شام اور مصر بحرِ روم کی وجہ سے رومیوں کے حملہ سے مامون نہیں تھے، امیر با تدبیر نے اس ملک کی سرحدوں پر چھاؤنیاں قائم کیں اور اپنے بحری بیڑہ کے ذریعہ رومیوں کو بحرِ روم میں شکستِ فاش دی کر اور بعض اہم جزیروں قبرص اور روڈس اور ارواڈ پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں اپنی چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے، جس سے مصر اور شام کے علاقے دشمن کے حملوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے، جزیرۂ کریٹ اور سسلی پر بھی حملہ کیا گیا مگر اس وقت تک فتح حاصل نہ ہو سکی پھر خود اندرونِ ملک میں جو سیاسی پارٹیاں تھیں اور جو اپنی انقلابی کوششوں کے ذریعہ اسلامی مرکزیت کو تباہ و برباد کرنا چاہتی تھیں ان کا استیصال کیا۔ ان فتوحات کے علاوہ بہت سے تعمیری کام بھی آپ نے ایسے کئے جن کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں جبر و تشدد کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں، لیکن ان کا یہ تشدد اس جراح کے تشدد کے مماثل ہے جو کسی عضو فاسد کو عملِ جراحی کے ذریعہ کاٹتا چھانٹتا ہے تو اس سے دوسرے اعضاء اس عضو بریدہ کے متعدی مرض سے محفوظ ہو جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی عملِ جراحی کے باعث تکلیف و اذیت اعضاءِ فاسدہ و صالحہ سب کو ہی محسوس ہوتی ہے جو شخص اس

؎۱ طبری ج ۶ ص ۱۸۶

دور کے حالات پر انصاف کی نگاہ سے غور کرے گا اس کو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ ان حالات پر قابو پانے کیلئے ایسے ہی جبر و تشدد کی ضرورت تھی جو حضرت امیر معاویہؓ نے اختیار کیا، اس وقت اسلام کی خدمت کا سب سے بڑا اقتضا یہ تھا کہ جس طرح بھی ہوتا اسلام کی سیاسی طاقت کو سنبھال لیا جاتا اور اس کو اندرونی اور بیرونی خطروں سے محفوظ و مامون کر دیا جاتا، معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے سامنے یہی چیز تھی، چنانچہ انھوں نے بہت سی ناگوار باتیں بھی برداشت کیں مگر اس مقصد کی تکمیل میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام جس رفتار سے پھیل رہا تھا اور جس طرح اس کی فتوحات کا دامن وسیع ہوتا جا رہا تھا، اس میں کمی کیا زیادتی ہی ہوتی رہی۔ اور سطحی نظر سے یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اس وقت اسلام روبہ انحطاط تھا یا اس کی ترقی میں جمود پیدا ہو گیا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنہ جلد دوم میں فرماتے ہیں۔

"خلافت جب بہت زیادہ ضعیف ہو گئی تو وہ ملوکیت کی شکل میں منتقل ہو گئی، حضرت معاویہؓ نے اس کو رحمت اور حلم سے قائم رکھا، اسلام میں کوئی بادشاہ حضرت معاویہ سے بہتر نہیں پیدا ہوا، وہ بے شبہ تمام ملوکِ اسلام میں سب سے اچھے تھے اور ان کی سیرت بعد میں آنے والے سلاطین کی سیرت سے کہیں زیادہ پسندیدہ تھی۔"

ملوکیت کے اثرات تاہم خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے جس طریقِ حکومت کی تشکیل ہوئی اس سے اسلام کے اجتماعی نظام کی روح کو شدید صدمہ پہنچا۔ حکومت بجائے جمہوری کے شخصی ہو گئی اور اسلام کے جو مصالح عامہ اس کے صالح ترین نظام سے وابستہ تھے، اب ان کا تعلق بادشاہ کی تنہا ذات اور اس کی شخصیت سے ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ چونکہ ذاتی طور پر فضائل مآب تھے اس لئے طریقِ حکومت کا یہ تغیر اول اول لوگوں کو محسوس نہیں ہوا، لیکن جو اربابِ نظر تھے وہ اس چیز کا کامل احساس رکھتے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور کہنا بھی نہیں چاہئے تھا کیونکہ اس کے یہ معنی تھے کہ امت کو پھر ایک اور فتنہ میں مبتلا کر دیا جائے لیکن دل میں وہ اس کا درد رکھتے تھے اور موقع ہوتا

تو کبھی کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی کرگذرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ فاتح قادسیہ سعد بن ابی وقاصؓ امیر معاویہؓ
کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح عجمی بادشاہوں کو کیا جاتا ہے امیر معاویہؓ
یہ دیکھکر ہنسے اور بولے "اگر تم مجھکو امیر المومنین کہدیتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا" فاتح قادسیہ نے جواب دیا "جس طریق
سے آپ نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھکو ملتی تو میں ہرگز اس کو قبول نہ کرتا۔"

بنوامیہ کا سب سے بڑا مخالف خاندان بنوہاشم تھا لیکن امیر معاویہؓ نے ذاتی طور پر حلیم و بردبار
ہونے کے باعث سریرِ خلافت پر متمکن ہو جانے کے بعد اس خاندان کے ساتھ بھی جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کیا،
بلکہ عطیات اور وظائف کے ذریعہ ان کی دلجوئی ہی کرتے رہے تاہم طرزِ حکومت میں ملوکیت کی شان نمایاں
تھی اور اس بنا پر اندازِ فکر اور طرزِ خیال میں جو تبدیلی پیدا ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس ایک معمولی واقعہ سے ہو سکتا
ہے کہ گورنرِ کوفہ زیاد عرب کی ایک فاحشہ عورت جس کا نام سُمَیَّہ تھا اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور عرب
کے رواج کے مطابق زیاد بن ابیہ کہلاتا تھا، یہ کنیت اس کے دامنِ شہرت پر ایک ایسا بدنما داغ تھا، کہ
"پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے" والا مضمون تھا امیر معاویہؓ زیاد کی قابلیتوں سے جو فائدہ اٹھانا چاہتے
تھے زیاد کی یہ بدنامی اس راہ میں سنگِ گراں کا کام کرتی تھی اس لئے انھوں نے حکمِ نبویؐ الولد للفراش و
للعاھر الحجر "بچہ کا نسب جائز نکاح سے ثابت ہوتا ہے اور زانی کے لئے تو سنگساری ہے" کا خیال نہ کرتے
ہوئے اعلانِ عام کرا دیا کہ آئندہ سے زیاد کو بجائے ابنِ ابیہ کہنے کے ابن ابی سفیان کہکر پکارا جائے۔
فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے زیاد کو خط لکھا اور اس میں انھوں نے
امیر معاویہؓ کے حکم کے مطابق زیاد بن ابی سفیان لکھا تو اس سے زیاد کو اتنی خوشی ہوئی کہ وہ لوگوں کو ام المومنین
کا یہ خط دکھاتا پھرتا تھا اور مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔"

یزید کے لئے بیعت لینا | یہ واقعہ اپنی حیثیت میں معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے
کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو اس کی اصل شکل و صورت سے منتقل کرکے کسی دوسری اور غیر واقعی شکل سے

منتقل کر دینے کے باعث تدریجی طور پر ذہنیت میں اور طرزِ فکر و خیال میں کیسی کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں
اور وہ رفتہ رفتہ کس طرح بنیادوں کو ہی متزلزل کر دینے کا باعث بن سکتی ہیں، چنانچہ اس طرزِ حکومت کا
سب سے زیادہ المناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے خلافت کے تصور سے ہی محروم ہو گئے۔ جمہور کا
حقِ انتخاب اربابِ حل و عقد کی اس باب میں مشاورت اور اس خدمتِ جلیلہ کے لئے امت کے کسی صالح
اور موزوں ترین فرد کی تلاش و جستجو، یہ سب باتیں ایسی خواب و خیال ہو گئیں کہ آج تک اسلام کی چشمِ تمنا پھر
اسی نظارۂ روح پرور کی بازدید کے انتظار میں نرگس کی طرح وا ہے، مگر وہ منظر لوٹ کر نہیں آتا، اور سالوں
بلکہ قرنوں کے ایسے تاریک پردے درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ نگہِ اشتیاق رہ رہ کے ماضی کے ان نقوش
جمال و عظمت کی طرف اٹھتی ہے مگر دیکھ نہیں سکتی۔ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کے
لئے بیعتِ خلافت لیکر اس طرزِ حکومت کو ایسا استوار کر دیا کہ آج تک اس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس وقت
صحابہؓ میں اور ان کے علاوہ تابعین میں بعض ایسے افراد موجود تھے کہ اگر حضرت معاویہؓ ان میں سے حضرت
عمرؓ کی طرح چند حضرات کا یا حضرت ابوبکرؓ کی طرح کسی ایک شخص کا انتخاب فرما کر بہ طورِ وصیت ان کے
حق میں خلافت کی سفارش کر جاتے تو بے شبہ وہ فساد پیدا نہ ہوتا جو یزید کو خلیفہ بنانے سے پیدا ہوا۔
اور جس کے باعث بادشاہت محض ایک خاندانی ورثہ ہو کر رہ گئی، خلیفہ کے لفظ میں دینی اقتدار کا مفہوم
بھی شامل تھا اس لئے بنو امیہ نے اس لقب کو ترک نہیں کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلافت تو اب ختم
ہو چکی تھی اور یہ جو کچھ بھی تھا ایک فریبِ اصطلاح سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔

بنو امیہ کے عہد پر تبصرہ

امیر معاویہ نے جس طرح حکومت بجبر حاصل کی تھی اسی طرح یزید کی بیعتِ خلافت بھی بجبر
لی گئی، جو حضرات دل سے اس کو پسند نہیں کرتے تھے ان کو بھی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دینا
ہی پڑا۔ ملوکیت یا شخصی حکومت کا سب سے زیادہ برا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام میں حریتِ فکر اور آزادیِ
بیان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قہر و غلبہ اور استبداد و تشدد کی فراوانی ہو جاتی ہے، بنو امیہ میں ملوکیت کے

یہ تمام جرائم پلئے جاتے تھے، امیر معاویہؓ کے بعد ان کے بیٹے یزید کے عہدِ حکومت میں ہی جو کچھ ہوا دنیا اس سے بے خبر نہیں ہے جگر گوشۂ رسولؐ اللہ نے اپنی قربانی سے اس استبداد کو ختم کرنا چاہا لیکن ختم نہیں ہوا، عبداللہ بن زبیرؓ ایسے مقدس صحابی نے اپنے خون سے قبائے اسلام کے ان دھبوں کو دھونا چاہا مگر نہ دھل سکے۔ اب سلطنت کا استحقاق صرف اس شخص کے لئے رہ گیا جو بجبر اپنے لئے حکومت کا تخت حاصل کرسکے، خواہ وہ اعمال و افعال کے لحاظ سے کیسا ہی نااہل اور حکومت کے لئے ناموزوں ہو، یزید سے لیکر آخری اموی خلیفہ مروان تک بجز دو ایک کے سب اموی خلفاء میں یہ بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ خلافِ طبع بات پر بیجا تشدد اور ناروا جبر سے کام لیتے تھے، ہشام بن عبدالملک نسبتاً بہتر تھا اور اس سے پہلے خلفائے بنی امیہ کے زمانوں میں منبروں پر علی الاعلان حضرت علیؓ پر جو سب وشتم کیا جاتا تھا اسے بند بھی کرادیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عصبیت کا یہ حال تھا کہ خاندانِ علیؓ میں سے کسی ایک کی تعریف نہیں سن سکتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ امام زین العابدینؓ (امام حسینؓ کے صاحبزادہ) طوافِ کعبہ کررہے تھے، جب وہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھے تو فرطِ ادب واحترام سے لوگوں کا ہجوم چھٹ گیا، لیکن جب ہشام بن عبدالملک بوسہ کے لئے آگے بڑھا تو مجمع میں سے ایک شخص نے بھی اس کے لئے راستہ نہیں چھوڑا۔ یہ دیکھکر ایک شامی نے امام زین العابدینؓ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا من ھذا یہ کون ہیں۔ ہشام امام سے اچھی طرح واقف تھا مگر اس وقت ازراہِ تجاہلِ عارفانہ بولا "میں نہیں جانتا" عربی کا مشہور شاعر فرزدق اس وقت موجود تھا۔ ہشام کی زبان سے امام عالی مقام کی شان میں یہ گستاخی برداشت نہ کرسکا اور اس نے برجستہ ایک قصیدہ پڑھا۔ یہ قصیدہ جو کم وبیش عربی ادب وتاریخ کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، خلوص ومحبتِ اہلِ بیت کے ایسے پاکیزہ جذبات سے پُر ہے کہ اربابِ ذوق اس کو پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں[1]۔ یہ ظاہر ہے کہ

---

[1] اس قصیدہ کا پہلا شعر ہے۔

ھذا سلیل حسینٍ وابن فاطمۃ　　　بنت الرسول من انجابت بہ الظلم

(باقی ص۵۰ پر ملاحظہ ہو)

فرزدق نے اس قصیدہ میں بنو امیہ پر کوئی طنز نہیں کیا اور نہ انھیں کچھ برا بھلا کہا تھا بلکہ شاعرانہ لطافتوں کے پیرایہ میں صرف اس قلبی عقیدت و ارادت کا اظہار کیا تھا جو بحیثیت مسلمان ہونے کے ہر ایک کو اس خاندان والا گھر کے ساتھ ہونی چاہیے پھر بھی ہشام اس کو برداشت نہ کر سکا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے اس "جرم" کی پاداش میں فرزدق کو قید کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بیت المال خلافت سے فرزدق کو جو وظیفہ ملتا تھا اسے بند کر دیا تھا۔"[1]

(بقیہ صفحہ ۴۹) ترجمہ:۔ یہ (امام زین العابدینؑ) حسینؓ کے فرزند دلبند ہیں اور فاطمہؓ کے لخت جگر۔ کون فاطمہؓ؟ جو رسول اللہؐ کی دختر نیک اختر تھیں جن کے ذریعہ تاریکیاں چھٹ گئیں۔

قصیدہ بہت طویل ہے لیکن اس کے بعض چیدہ چیدہ اشعار آپ بھی سن لیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

هٰذا الذی تعرف البطحاءُ وطأتَہٗ ۔۔۔ والبیت یعرفہٗ والحلّ والحرمُ

اذا رأتہٗ قریش قال قائلھم ۔۔۔ الیٰ مکارمِ ھذا ینتھی الکرمُ

ھذا ابنُ خیر عبادِ اللہ کلّھم ۔۔۔ ھذا التقی النقی الطاھرُ العلَمُ

یکادُ یمسکہٗ عرفانَ راحتہٖ ۔۔۔ رکنُ الحطیم اذا ما جاء یستلمُ

یبین نور الضُّحیٰ من نورِ غرّتہٖ ۔۔۔ کالشمس ینجاب من اشراقھا القتمُ

مُشتقّۃٌ من رسول اللہِ نبعتہٗ ۔۔۔ طابت عناصرہٗ والخیمِ والشیمُ

ھو ابن فاطمۃَ ان کنتَ جاھلہٗ ۔۔۔ بجدّہٖ انبیاءُ اللہِ قد ختموا

ولیسَ قولك من ھذا بضائرہٖ ۔۔۔ العرب تعرف من انکرت والعجمُ

من معشرٍ حبّھُمُ دینٌ وبغضھُم ۔۔۔ کفرٌ وقربھُم منجیً ومُعتصَمُ

ان عُدّ اھلُ التقی کانوا ائمّتھم ۔۔۔ او قیل من خیرُ اھل الارضِ قیل ھُمُ

لا یقبض العُدمُ بسطاً من اکفھم ۔۔۔ سیان ذلك ان اثروا وان عدموا

من یعرفِ اللہَ یعرف اوّلیّۃَ ذا ۔۔۔ والدین من بیتِ ھذا نالہُ الامُمُ

ما قال لا قطّ الا فی تشھّدہٖ ۔۔۔ لولا التشھد کانت لاؤہٗ نعمُ

(اغانی ۱۵ ص ۳۲۷ ملخصاً)

ترجمہ:۔ (۱) یہ تو وہ ہیں جن کے قدموں کی آہٹ کو بطحاء کی زمین بھی پہچانتی اور بیت اللہ اور حرم و غیر حرم سب

صفحہ ہذا۔ [1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۲

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف خلفارِ بنی امیہ خاندانِ نبوت کے ساتھ تعصب و عناد کا یہ معاملہ کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کی فراخدلی اور وسیع المشربی کا یہ عالم ہے کہ اخطل جیسے عیسوی شعرا بے تکلف ان کے دربار میں آتے جاتے ہیں خلفار کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور بعض غیر اسلامی حرکتیں جو ان شعرار سے سرزد ہوتی ہیں ان کو بھی انگیز کرلیا جاتا ہے۔ اس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد سے ہی ملوکیت کے تباہ کن اثرات ظاہر ہونے لگے تھے یعنی خلفار کا اصل مقصد اپنے اور اپنے

(بقیہ صفحہ ۵۰) اس سے آشنا ہیں۔

(۲) اہلِ قریش انھیں دیکھتے ہیں تو ان کا کہنے والا پکار اٹھتا ہے " انھیں کے مکارم اخلاق پر تو کرم کی انتہا ہوگئی ہے۔

(۳) یہ اللہ کے بندوں میں جو سب سے بہتر بندہ تھا اس کے نورِ نظر ہیں یہ پاک و صاف، متقی پرہیزگار اور سردار ہیں۔

(۴) یہ جب بیت اللہ کا طواف کرتے کرتے رکنِ حطیم کا بوسہ دینے کے لئے اپنے ہاتھ دراز کرتے ہیں تو چونکہ رکنِ حطیم بھی ان کی ہتھیلی کو پہچانتا ہے اس لئے وہ ان کے ہاتھوں کو پکڑنے لگتا ہے۔

(۵) ان کی پیشانی کا نور چاشت کے وقت کے خورشید درخشاں کی طرح چمکتا ہے جس کے چمکنے سے تاریک غبار چھٹ جاتا ہے

(۶) ان کا مایۂ خمیر رسول اللہ کے مایۂ خمیر سے تیار ہوا ہے اس بنا پر ان کے عناصرِ وجود پاک و صاف ہیں اور ان کے خصائل و شمائل بھی۔

(۷) یہ فاطمہؓ کے لال ہیں اگر تو ان کو نہیں جانتا تو نہ جانے۔ انھیں کے نانا پر تو اللہ کے پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

(۸) تیرا یہ پوچھنا کہ " یہ کون ہیں" انھیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے جسے تو نہیں جانتا تمام عرب اور عجم اسے پہچانتا ہے۔

(۹) یہ اس خاندان والا شان میں سے ہیں جس کی محبت عین دین ہے اور جس سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس کا قرب نجات اور پناہ کا مستقر ہے۔

(۱۰) اگر اہلِ تقویٰ کا شمار کیا جائے تو یہ حضرات ان سب کے امام قرار پائیں گے یا اگر پوچھا جائے کہ تمام اہلِ زمین میں سب سے بہتر کون ہیں؟ تو جواب ملیگا " یہی "۔

(۱۱) تنگدستی بھی ان کے ہاتھوں کی فراخی اور کشادگی کے لئے مانع نہیں ہوتی، ان کیلئے دونوں حالتیں برابر ہیں، خواہ یہ صاحبِ ثروت ہوں یا نہ ہوں۔

(۱۲) جو شخص اللہ کو جانتا ہے وہ ان کی (امام زین العابدینؒ) اولیت وفضیلت کو بھی پہچانتا ہے (کیونکہ) قوموں نے دینِ حق کی دولت انھیں کے کاشانۂ قدس سے تو پائی ہے۔

(۱۳) انھوں نے (فرطِ جود و سخا سے) سوائے تشہد کے کبھی لا (نہیں) کہا۔ اگر تشہد کا معاملہ نہ ہوتا تو ان کا لا بھی نعم (ہاں) ہوتا۔

خاندان کی وجاہت و برتری کو قائم رکھنا تھا اور ذاتی مفاد کو قومی و جماعتی مفاد پر مقدم رکھا جاتا تھا۔

عمال کا ظلم خلفاء میں قہر و استبداد اور غرض پرستی کا غلبہ ہوتا ہے تو عمال اور حکومت کے مختلف صیغوں اور اداروں کے ذمہ دار افراد میں بھی طرح طرح کی بے عنوانیاں پیدا ہوجاتی ہیں چنانچہ بنو امیہ کے عمال نے بھی اسلامی روح کو یکسر فراموش کر کے ناجائز کارروائیوں اور انتہا درجہ کے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی، زیاد اور اس کے بیٹے عبید اللہ نے مدینہ اور عراق میں جو کچھ کیا اس کو سنکر بھی بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ حجاج نے مسعودی کی روایت کے مطابق سوا لاکھ کے قریب بے گناہوں کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپایا مگر اس کے باوجود عبد الملک بن مروان ایسا بیدار مغز اموی خلیفہ بھی حجاج کے ساتھ اغماض و مسامحت کا معاملہ کرتا اور اسے اپنی خلافت کے استحکام کا ایک بڑا ذریعہ سمجھتا رہا۔

بنو امیہ کا تعصب بنو امیہ کی حکومت کا ایک بڑا طغرائے امتیاز ہے کہ ان لوگوں میں قبائلی عصبیت کے علاوہ عربیت اور عجمیت کا تعصب بھی پایا جاتا تھا۔ عجم کے جو لوگ مسلمان ہو ہو کر عربوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے تھے بنو امیہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھے جاتے تھے اور ان پر بعض اوقات ناروا مظالم کئے جاتے تھے، حجاج کے متعلق مشہور روایت ہے کہ اس نے موالی (نومسلم عجمیوں) کی ایک کثیر جماعت کو جلاوطن کر کے اطراف و اکناف کے دیہاتوں میں محض اس لئے منتشر کردیا تھا کہ یہ لوگ عربوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے باعث فصیح و بلیغ عربی بولنے پر قادر نہ ہوسکیں۔ اس بیجا اور غیر اسلامی تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں نے حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کردیں اور یہیں سے ایک عظیم الشان تحریک شعوبیت کا آغاز ہوا جس نے آگے چلکر بعض اچھے اچھے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بیت المال کی بد نظمی خلفاء راشدین کے زمانہ میں بیت المال پوری قوم کی ایک امانت تھی اس کے ایک ایک پیسہ کو احتیاط سے خرچ کیا جاتا تھا خلفاء اس میں سے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورتوں کے لئے کچھ لیتے بھی تھے تو صرف اتنا ہی جس سے معمولی طریقہ پر گذر بسر ہوسکے، لیکن اس کے برعکس خلفاء بنو امیہ

مسلمانوں کی اس امانت کو اپنی ذاتی اور شخصی ملکیت سمجھتے تھے، اسے جس طرح چاہتے خرچ کرتے تھے، خود شاہانِ عجم کی سی شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور اس کے لئے جتنے اخراجات کی ضرورت ہوتی انھیں بیت المال سے ہی پورا کرتے تھے، اپنے مسرفانہ اخراجات کے علاوہ عمال کو بھی بیش قرار تنخواہیں دیجاتی تھیں اور وہ بھی خلفاء کی طرح پُرشکوہ اندازِ معاشرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ جو لوگ بنو امیہ کا پروپگنڈہ کرتے تھے، یا جن سے حکومت کو کسی قسم کی قوت بہم پہنچنے کا احتمال تھا ان پر قوم کی امانت بے دریغ خرچ ہوتی تھی اور ان کے برخلاف جو لوگ حریتِ فکر و رائے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے، باوجود استحقاق کے ان کے مقررہ وظائف بند کر دیئے جاتے تھے، چنانچہ یزید نے اہلِ حرمین کے وظائف بند کر دیئے تھے، انصار کی مقررہ تنخواہیں محض اس بنا پر کئی بار روک دی گئیں کہ وہ اہلِ بیت کی حمایت کرتے ہیں۔

ان فضول خرچیوں اور بے اعتدالیوں کے باعث بیت المال پر ناجائز مصارف کا بار پڑتا تھا تو اس کو پورا کرنے کے لئے خلفاء خود اور ان کے عمال ٹیکسوں اور جزیہ و خراج کے وصول کرنے میں ناروا تشدد سے کام لیتے تھے اور اس میں جائز و ناجائز کا فرق و امتیاز بھی مرعی نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں اس سے بڑھکر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ بعض صوبوں میں ان لوگوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا جو ذمی سے مسلمان ہو گئے تھے، عمال کے اس جبر و تشدد کا جس کی بنیاد ہوسِ زر پر قائم تھی نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ اور خراساں کے عام نومسلموں میں اسلام کی طرف سے بددلی پیدا ہو گئی۔

افتراق و تشتت جس نظامِ حکومت کی بنیاد ذاتی منفعت طلبی پر ہو اس سے بمشکل یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی معاملہ میں بھی جماعتی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے کسی فائدہ کو قربان کر سکتا ہے، بنو امیہ سیاست اور طرزِ جہاں بانی میں مشہور ہیں کیا اچھا ہوتا اگر ان کی یہ سیاسی قابلیتیں اسلامی طرزِ حکمرانی کو بحال کرنے میں صرف ہوتیں مگر یہاں معاملہ برعکس نظر آتا ہے، وہ بہر نہج اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ حکومت ان کے خاندان سے منتقل ہو کر کسی اور خاندان میں نہ چلی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کو اس بات

میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا کہ عرب کے مختلف قبائل میں عہدِ جاہلیت کے مٹے ہوئے تعصبات کو ابھار کر ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کے خلاف لڑائیں اور اس طرح مسلمانوں میں وحدتِ اجتماعی باقی نہ رہنے دیں۔ چنانچہ عرب میں جو مضری اور یمنی قبائل آباد تھے ان میں شروع سے رقابت چلی آرہی تھی۔ اسلام نے ان کو ایک ہی رشتۂ توحید میں منسلک کر کے بھائی بھائی کر دیا تھا مگر اب بنوامیہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ان خاکِ نسیاں میں دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر اپنے دامنِ افساد سے ہوا دیکر مشتعل کر دیا اور اس کا نتیجہ افسوسناک کشت وخونریزی کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں بعض کبارِ تابعین بھی کام آگئے۔

ان واقعات وحالات سے یہ امر محتاجِ نظر نہیں رہتا کہ بنوامیہ کی حکومت شخصی اور استبدادی حکومت تھی اور اس میں اس روح کا فقدان تھا جو اسلام کے نظامِ اجتماعی کی بنیاد و اساس ہے، تاہم ناانصافی ہوگی اگر اس عہد کے تاریک پہلو کے ساتھ اس کے بعض روشن پہلوؤں پر بھی روشنی نہ ڈالی جائے۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

صحتِ عقائد | بنوامیہ کے عہدِ حکومت کا ایک روشن کارنامہ یہ ہے کہ اس خاندان کے افراد ذاتی طور پر خواہ کیسے ہی رہے ہوں لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے تمام خلفا صحیح العقیدہ تھے اور اس بنا پر انھوں نے فرقِ باطلہ کے قلع قمع کرنے میں جس غیر معمولی بہادری اور حزم ودوراندیشی کا ثبوت دیا ہے وہ بے شبہ مستحق تحسین ہے۔

عبدالملک بن مروان | اس سلسلہ میں عبدالملک بن مروان کا نام سرفہرست ہونا چاہئے، عبدالملک ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک حکمراں رہا۔ اس کے بست ویک سالہ دورِ حکومت کی تاریخ فتنوں اور شورشوں سے پُر ہے۔

خوارج کا استیصال | نہروان میں شکست کھانے کے بعد خوارج نے پھر فارس اور عراق میں اپنی تنظیم شروع کر دی تھی اور اس زور سے اپنے عقائد باطلہ کی تبلیغ شروع کی تھی کہ بعض اچھے اچھے راسخ العقیدہ مسلمان بھی ان کے ہمدرد بن چلے تھے اس بنا پر یہ فرقہ ضالہ اسلام کے لئے ایک نہایت خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا، عبدالملک بن مروان نہایت استقلال وپامردی کے ساتھ ایک عرصہ تک ان کا مقابلہ کرتا رہا، اور

آخر کار ان کا سارا زور ختم کر کے دم لیا۔

فتنۂ مختار | اس کے علاوہ مختار بن ابی عبید ثقفی کا فتنہ بھی خوارج کے شر سے کسی طرح کم ہلاکت انگیز نہ تھا اس نے مختلف پارٹیوں کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر بنو امیہ کی حکومت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مختار خود نہایت بیہودہ عقائد کا انسان تھا اگر اس وقت اس کو عرب میں سیاسی اقتدار قائم کرنے کا موقع ملجاتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آج امتِ مرحومہ کی اکثریت گمراہی کے کس ورطۂ عظیم میں مبتلا ہوتی۔

توابین | پھر توابین کا گروہ کہنے کو توّابؔ تھا لیکن ان کا حال بالکل اس شعر کا مصداق تھا ؎

تغافل سے جو باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ ظاہر ہے کہ جن بزدلوں نے امام حسینؓ کو کوفہ بلا کر خونِ شہادت سے غسل کرنے کے لئے یکہ و تنہا چھوڑ دیا ہو۔ اب اگر وہ بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر اور اس طرح امام شہید کے قاتلوں سے انتقام لیکر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر بھی دیتے تو عرب کی مختلف سیاسی اور طاقتور جماعتوں پر کس طرح اپنا اثر و نفوذ قائم رکھ سکتے تھے، یہ گروہ اپنے آپ کو توابین (توبہ کرنیوالے) کہکر امام حسینؓ کے ساتھ اپنی بے وفائی کا تدارک کرنا چاہتا تھا لیکن امام عالی مقام کی روح پر فتوح ان سے خطاب کر کے کہہ رہی تھی ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اب اس کے سوا اور کیا چارۂ کار تھا کہ "مشتے بعد از جنگ" کو خود انھیں کے کلہ پر ماردیا جاتا۔

عراقیوں کی شورش | عراقی طبعاً نہایت شورش پسند واقع ہوئے تھے جب ان کو اپنی کوششیں ناکام ہوتی نظر آئیں تو انھوں نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو اپنا آلۂ کار بنا کر ایک ہنگامۂ محشر خیز بپا کر دیا لیکن عبدالملک نے ان کے بھی کس بل نکالدیئے اور حجاج کی قیادت میں ایک لشکرِ جرار بھیجکر ان کی بغاوت کا خاتمہ کر کے رکھدیا۔

ان اندرونی شورشوں اور فتنوں کے فرو کرنے کے علاوہ عبدالملک نے شمالی افریقہ کے بربریوں و جزیرۂ صقلیہ اور قرطاجنہ کے رومیوں کو ان کی سرکشی کی ایسی سخت سزا دی کہ ان علاقوں پر مسلمانوں کا دوبارہ

محفوظ قبضہ ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان نے اس پُر آشوب دور میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کو قائم کرنے کی راہ میں جس غیر معمولی حزم و عزم اور جرأت و ہمت کا ثبوت دیا اس پر وہ بے شبہ لائقِ تحسین و آفرین ہے۔ عبدالملک کو تاریخ میں اموی حکومت کا مجدد یا موسس ثانی کہا جاتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ عبدالملک کا احسان صرف اموی حکومت پر نہیں بلکہ اسلام کی شانِ مرکزیت کا بقا اور فرقِ باطلہ کے مقابلہ میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کی فتح بھی بڑی حد تک اس کی مرہونِ کرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعضوں نے عبدالملک بن مروان کو امیر معاویہؓ کا ہم پایہ قرار دیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک سیاسی سمجھ بوجھ اور شجاعت و دلیری کا تعلق ہے وہ اس کا بجا طور پر مستحق ہے۔

مسعودی[1] نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے عبدالملک کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے، موصوف کا بیان ہے "سنہ ۶۶ھ میں عبدالملک کوفہ میں مختار سے جنگ کرنے شامی افواج کو اپنی کمان میں لئے ہوئے چلا جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک شب اس کو عبیداللہ بن زیاد کے قتل ہو جانے اور اس کے لشکر کی شکست خوردگی کی خبر ملی، ساتھ ہی اُسے اطلاع ملی کہ جو فوج عبداللہ بن زبیرؓ سے جنگ کرنے مدینہ گئی تھی اس کا کمانڈر مارا جا چکا ہے۔ اس خبر کے بعد ہی فوراً اُسے معلوم ہوا کہ عبداللہ بن زبیر کا لشکر فلسطین کی سرزمین میں داخل ہو چکا ہے اور ان کے بھائی مصعب بن زبیر بھی ان سے جا ملے ہیں، اس کے ساتھ ہی اطلاع پہنچی کہ شہنشاہِ روم شام کے ارادہ سے روانہ ہو چکا ہے اور اب مصیصہ کے مقام پر اپنی فوجِ گراں لئے پڑا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی ایک مخبر نے خبر دی کہ دمشق کے شورہ پشتوں نے وہاں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے اور اہلِ شہر پر طرح طرح کے ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، یہاں تک کہ قیدی بھی قید خانوں کی سلاخیں توڑ کر بھاگ نکلے ہیں اور اعراب کے ایک گروہ نے حمص اور بعلبک وغیرہ میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو پے بہ پے ایک ہی وقت میں ان پریشان کن خبروں کو سُنکر ہوش و حواس کھو بیٹھتا لیکن عبدالملک

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۱۱۳

کی جرأت و دلیری اور ہمت و بہادری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ان اطلاعات کو سنکر ایک لمحہ کے لئے بھی دل گرفتہ نہیں ہوا، رات بھر ہنستا اور قہقہے لگاتا رہا۔ اور اس کی ہر ہر ادا سے عزم مصمم اور ثباتِ قلب و دماغ کا اظہار ہوتا تھا۔

اس زمانہ کے حالات کا اقتضا یہ تھا کہ جس طرح بھی ہوتا فرق باطلہ کا زور توڑا جاتا اور باغیوں کی سرکوبی کرکے انھیں اس کا موقع نہ دیا جاتا کہ وہ اپنے اغراضِ فاسدہ کی تکمیل کے لئے بعض بھولے بھالے سادہ لوح مسلمانوں کی آڑ لے کر اسلام میں لامرکزیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس طرح اندرونی تحفظات کے مضبوط ہو جانے کے باعث ہمسایہ طاقتوں کو مسلمانوں پر یورش کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکے۔ جہانتک حالات کے اس اقتضا کا تعلق ہے یہ امر تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ عبدالملک بن مروان نے وقت کی اس ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ایک طرف اس نے اندرونی بغاتوں اور شورشوں کو بڑی ہمت، جسارت اور تدبیر سے دبایا اور فنا کیا اور دوسری جانب رومیوں اور بربریوں کی سرکشی کو ملیامیٹ کرکے اسلام کی سیاسی مرکزیت کو اس قدر مضبوط بنا دیا کہ اس کی وسعتوں کا دامن سمٹنے کے بجائے پھیلتا ہی رہا اور اس کو عروج حاصل ہوتا رہا۔

عبدالملک بن مروان نے اسلام کی صرف سیاسی خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ اس نے متعدد تعمیری کام بھی کئے وہ خود بڑا صاحب علم و فضل اور باکمال تھا، قرآن مجید کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا، جگہ جگہ اس مقصد کے لئے مکاتب قائم کئے حکومت کی دفتری زبان فارسی اور رومی تھی اُن دفاتر کو عربی زبان میں منتقل کیا جس سے عربی زبان کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس کو عظیم الشان فروغ حاصل ہوا۔ بعض نئے شہر بھی آباد کرائے گئے اور کئی ایک مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں۔

ولید بن عبدالملک عبدالملک بن مروان کے بعد اس کا بیٹا ولید سریرآرائے خلافت ہوا، یہ اگرچہ باپ کی طرح صاحبِ علم و فضل تو نہیں تھا مگر طرزِ جہانبانی و فرمانروائی میں بہت ممتاز تھا۔ مذہبی زندگی بھی

بہت سوں کے لئے درسِ عبرت کا موجب تھی، عبد الملک اپنے عہد میں عرب کی اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کا خاتمہ کر ہی چکا تھا۔ ولید نے اس فرصت سے فائدہ اٹھایا اور خوش قسمتی سے اسے محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم ایسے بہادر اور مدبر سپہ سالار بھی مل گئے جنھوں نے اپنے شاندار کارناموں سے اسلامی تاریخ کو چار چاند لگا دیئے، چنانچہ قتیبہ بن مسلم نے خراساں، خوارزم اور چینی ترکستان فتح کیا، محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور سخت ترین معرکوں کے بعد اس مہم کو سر کیا۔ موسیٰ بن نصیر نے اندلس کی سرزمین پر پہنچکر اسلامی حکومت وسلطنت کا پرچم لہرایا۔ اس طرح چین سے اسپین تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیرنگین آگیا۔ ان فتوحات کے علاوہ ولید کو تعمیری کاموں کی طرف بھی بڑی توجہ تھی، اس نے نہایت عمدہ اور خوبصورت مسجدیں تعمیر کرائیں، فوج کی باقاعدہ تنظیم کی، تبلیغی ادارے قائم کئے اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی قرآن مجید کے درس کے لئے جگہ جگہ مکاتب قائم کئے اور علماء ومتعلمین کے وظائف مقرر کرکے ان کو فکرِ معاش سے آزاد کیا اور گداگری کا انسداد کرکے مسلمانوں کو فرمانِ نبویؐ "السوال ذلّ" یاد دلایا۔

قسطنطنیہ پر مسلسل ناکام حملے

جس طرح اندلس کی فتح سے اسلامی فتوحات کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کے سیاسی عروج کی ایک روشن دلیل ہے [illegible] طرح مشرقی رومن امپائر کے دار السلطنت قسطنطنیہ کے معرکہ میں مسلمانوں کی ناکامیابیاں بھی اپنے اندر عبرت وبصیرت کی بہت سی داستانیں رکھتی ہیں۔ اندلس کی فتح کے ساتھ اس ناکامی کا حال پڑھکر اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں کس طرح اسلامی فتوحات کی وسعت کے باوجود زوال وانحطاط بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے، گویا جسم بظاہر بہت توانا اور فربہ تھا مگر روح اندرونی طور پر اضمحلال پذیر ہورہی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی کسی مادی ناکامی کی شکل وصورت میں اس کا ظہور ہوتا ہی رہتا تھا۔ اس بنا پر یہاں قسطنطنیہ کا محاصرہ اور اس کی ناکامی کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا شاید بے موقع نہ ہوگا۔

قسطنطنیہ مشرقی یورپ کا دروازہ تھا مسلمان اس کی اہمیت اور اس کو فتح کرنے کی ضرورت کو اچھی

طرح محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے عہد میں (۳۲ھ مطابق ۶۵۳ء) امیر معاویہؓ ایک فوج لیکر روانہ ہوئے اور ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے آبنائے باسفورس کے کنارہ تک پہنچ گئے۔ اسی زمانہ میں بسر بن ارطاۃ نے فونکس (Phoenix.) پہاڑ کے سامنے رومی بیڑہ کو شکست فاش دی جس کی کمان شہنشاہ کونسٹین دوم کر رہا تھا۔ اس بحری جنگ میں بیس ہزار رومی سپاہی کھیت رہے لیکن مسلمان فوج کے نقصانات بھی کچھ کم نہ تھے۔ ان نقصانات کے باعث مسلمان اس کو فتح نہ کر سکے اور وہ واپس آگئے۔

اس کے بعد ۴۲ھ میں جبکہ امیر معاویہؓ کی خلافت تسلیم کی جا چکی تھی اور دمشق بنو امیہ کا دارالسلطنت قرار پا چکا تھا، قسطنطنیہ پر خشکی اور سمندر دونوں طرف سے حملہ ہوا۔ بری فوج کی کمان عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کر رہے تھے اور بحری بیڑہ حسب سابق بسر بن ارطاۃ کی کمان میں تھا۔ یہ بیڑہ بحر مارمورہ تک پہنچ چکا تھا لیکن موسم سرما کی شدت کے باعث یہاں کوئی کارروائی نہ کی جا سکی اور مسلمانوں نے سردی کا موسم اناطولیہ میں گزارا۔ اس کے بعد ۴۸ھ میں حضرت معاویہؓ نے پھر بڑے ساز و سامان کے ساتھ حملہ کی تیاریاں شروع کیں، شام اور مصر کی بندرگاہوں میں فضیلۃ بن عبید الانصاری کی قیادت میں ایک بڑا بحری بیڑہ متعین کیا جو اناطولیہ کو عبور کرتا ہوا کلیسڈون تک فتوحات کرتا چلا گیا۔ دوسرے سال یعنی ۴۹ھ میں سفیان بن عوف الازدی کی زیر قیادت پھر ایک بڑی فوج قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجی گئی، یزید بن معاویہ بھی اس لشکر میں شامل تھا اور اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ایوب انصاری ایسے جلیل القدر صحابہ کرامؓ بھی اس میں شریک تھے۔ اس بری فوج کے علاوہ بحری بیڑہ جس کی کمان بسر بن ارطاۃ کر رہا تھا رودبار دانیال کی موجوں کو چیرتا ہوا مشرقی رومن امپائر کے دارالسلطنت سے چند میل کے فاصلہ پر یورپین ساحل تک پہنچ گیا۔ گویا یہ کہنا چاہئے کہ مسلمان اس وقت قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے تھے۔ مشرقی امپائر کے شہنشاہ کو مسلمانوں کی ان عظیم الشان

تیاریوں کا علم پہلے سے ہو چکا تھا اور اس بنا پر اس نے مقابلہ کی تیاریاں بھی بڑے پیمانہ پر کر رکھی تھیں اور ان کے پاس ایک نیا ہتھیار بھی تھا جسے یونانی آگ (Greek Fire.) کہتے ہیں اور جو تارپیڈو کا کام کرتا تھا۔ مسلمان کئی دن تک اپنی بری اور بحری فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کئے پڑے رہے ...... اور صبح سے شام تک برابر حملے کرتے رہے، حضرت ابوایوب انصاریؓ اور عبدالعزیز بن زرارہ کلبی اس معرکہ میں شہید ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا اور مسلمانوں کو ناکام لوٹنا پڑا۔ اب انھوں نے قسطنطنیہ سے اسی میل کی مسافت پر اپنے ڈیرے خیمے ڈالدیئے اور کئی سال تک ان کا معمول یہی رہا کہ جاڑوں میں یہاں آجاتے تھے اور گرمیوں کے موسم میں پھر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کرنے کی سعی کرتے تھے۔ ان مسلسل ناکامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہازوں کا، آدمیوں کا اور دوسرے سازوسامانِ جنگ کا شدید نقصان برداشت کرنا پڑا۔ آخر کار ۵۸ھ میں یہ لشکر واپس آگیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان لڑائیوں میں تیس ہزار فداکارانِ اسلام کی جانوں کا نقصان ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان پیہم شکستوں نے جہاں رومیوں کے حوصلے بڑھا دیئے ان سے مسلمانوں کی عظمت کو بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچا آخر کار امیر معاویہؓ نے رومیوں سے ایک معاہدہ کر لیا جو چالیس سال تک قائم رہا۔

قسطنطنیہ کے محاصرہ میں مسلمانوں کو جو مسلسل ناکامیاں اٹھانی پڑی تھیں وہ کوئی ایسی معمولی چوٹ نہ تھی جس کا اثر امتدادِ ایام کے ہاتھوں مٹ جاتا۔ بلکہ اسلامی فوج کے دل و جگر پر ایک ایسا داغ تھا جو رہ رہ کے ابھرتا تھا اور ان کو بیقرار کر جاتا تھا۔ چنانچہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں جب موسیٰ بن نصیر اندلس کی مہم سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو گیا تو اس نے چاہا کہ وہ اپنا رخ مغرب سے مشرق کی طرف کر دے اور اس طرح قسطنطنیہ ہوتا ہوا دمشق پہنچے تاکہ عیسائیت اور عیسائی حکومت دونوں کا اقتدار بیک وقت ختم ہو سکے لیکن دربارِ خلافت کی طرف سے موسیٰ کو اس کی اجازت نہیں ملی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فتوحات فرانس کے جنوب تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔

سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ

ولید کی وفات کے بعد اس کا حقیقی بھائی سلیمان تخت خلافت پر ۹۶ھ مطابق ۷۱۵ء میں متمکن ہوا اس وقت بنو امیہ کی حکومت اندرونی بغاوتوں اور شورشوں سے مامون تھی۔ سیاسی فتوحات نے حوصلے بلند اور ہمتیں مستحکم کر دی تھیں اعلیٰ تربیت یافتہ اور منظم فوج گراں موجود تھی۔ اسلحہ اور ساز و سامان جنگ کی بھی کمی نہ تھی، پھر دوسری طرف بازنطینی حکومت میں طوائف الملوکی پیدا ہو چلی تھی۔ بیس برس کی قلیل مدت میں چھ قیصر تخت نشین ہوئے اور معزول کر دیئے گئے تھے۔ بلغاری اور سلافی (Sclavonians) شمالی صوبجات کو پامال کر کے دارالسلطنت کی دیواروں تک پہنچ چکے تھے اور دوسری جانب عرب ایشیائے کوچک میں سے گذر کر اپنی فتوحات کا دامن آبنائے باسفورس کے ساحل تک پھیلا چکے تھے، خود اندرون ملک شورشیں اور بغاوتیں برپا تھیں۔ اس صورت حال کو اپنے موافق دیکھکر سلیمان بن عبدالملک نے قسطنطنیہ پر از سر نو حملہ کرنے کا ارادہ کیا اس مقصد کے لئے سلیمان نے بری اور بحری فوجیں بڑی بھاری تعداد میں مہیا کیں اور ان کو طرح طرح کے سامان اور اسلحۂ جنگ سے آراستہ و پیراستہ کر کے اپنے بھائی مسلمۃ بن عبدالملک کی زیر قیادت روانہ کیا، خود والق میں ٹھہر گیا اور بھائی کو ہدایت کر دی کہ یا تو قسطنطنیہ فتح کرنا ورنہ وہیں مقیم رہ کر میری دوسری ہدایات کا انتظار کرنا ۹۸ھ کے آغاز یعنی ستمبر ۷۱۶ء میں مسلمہ نے اناطولیہ کے مرتفع میدانوں کو پامال کیا اور کئی ایک بازنطینی قلعے اور شہر فتح کر لئے۔ اس کے بعد اناطولیہ کے دارالسلطنت عموریہ کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ عموریہ کا گورنر ایک شخص لیو (Leo) تھا جو بڑا بہادر حوصلہ مند اور چالاک تھا اس نے مسلمہ سے صلح کر لی مگر پھر قیصر کو معزول کر کے خود قسطنطنیہ کے تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا مسلمہ نے نہایت بہادری اور ہمت سے ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ بازنطینی مورخین کا اندازہ ہے کہ اسوقت خشکی اور سمندر کی جانب سے مسلمانوں کی جو فوج قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جمع ہو گئی تھی اس کی تعداد ایک لاکھ اسّی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سلیمان والق میں بیٹھا ہوا برابر امدادی فوجیں اور ضرورت کی چیزیں

بھیج رہا تھا اور مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی آرزو میں بار بار

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

مسلمہ نے بحر مارمورہ کے ساحل ساحل چلکر اپنی بری اور بحری دونوں فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا اور منجنیقوں سے گولہ باری شروع کردی، یہ محاصرہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ لیکن اسوقت بھی قدرت کو منظور نہ تھا کہ مسلمان فاتح اور فائز المرام ہو کر لوٹیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اس محاصرہ میں بھی شدید نقصانات اٹھانے پڑے۔ پھر سردی بھی اس سال اس قدر شدید ہوئی کہ عرب اس کو برداشت نہ کر سکتے تھے ہزاروں مر گئے اور ہزاروں سخت بیمار ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے۔ ادھر سامانِ رسد جو ساتھ تھا وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے آپ کو ان حالات کا علم ہوا تو مسلمہ کو حکم بھیجا کہ قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھا لیا جائے اور اسلامی فوجیں واپس لوٹ آئیں، چلتے چلتے ایک اور ستم یہ ہوا کہ یونانیوں نے ایڈریا نوپل کی اسلامی فوج کے بقیہ بحری دستوں پر حملہ کر دیا جس کے باعث بہتیرے جہاز غرق ہو گئے صرف چند ایک جو بچ رہے تھے شام کی بندرگاہ تک پہنچ سکے۔

اس مرتبہ کی ناکامی ایسی حوصلہ شکن تھی کہ اس کے بعد سے نویں صدی ہجری کے نصفِ ثانی تک یہ مہم سر نہ ہو سکی یہانتک کہ ۱۴۵۳ء میں یعنی مذکورہ بالا معرکہ سے کامل آٹھ سو سال بعد ترکوں نے اس کو فتح کیا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر اس وقت مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو آج یورپ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصر و شام و عراق کی طرح یہاں کی آبادی کا بھی اکثر و بیشتر حصہ فرزندانِ توحید پر مشتمل نہ ہوتا۔ لیکن۔

یُرِیدُ المرءُ ان یُعطی مُناہ ۔۔۔ ویأبی اللّٰہُ الّا ما یشاءُ

ترجمہ:۔ آدمی چاہتا ہے کہ اس کو اس کی مراد مل جائے۔ لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

ناکامی کے اسباب

مورخین نے ان اہم معرکوں میں ناکامی کے مختلف وجوہ واسباب بیان کئے ہیں مثلاً ایک یہ کہ عربوں کو بحری جنگ کا کامل تجربہ نہ تھا۔ (۲) مسلمۃ بن عبدالملک نے عموریہ کے گورنر لیو پر اعتماد کر کے غلطی کی اور اُسے اپنا ہمراز بنا لیا۔ (۳) موسم کی شدت عربوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ (۴) رومیوں کے پاس طاقت وقوت زیادہ تھی اور اسلحہ بھی بعض نئی قسم کے تھے۔

مادی اعتبار سے یہ اسباب مسلمانوں کی ناکامی میں موثر ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کے علاوہ ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان امرا جو اس وقت اسلامی فوج میں نمایاں اثر رکھتے تھے روحانی اعتبار سے کسی بڑی عظمت کے مالک نہیں تھے، تشدد، جبر و ظلم، استبداد اور سخت گیری خلفاء سے لیکر معمولی درجہ کے عمّال وولاۃ تک کا شیوہ تھی، مسلمان تو مسلمان خود غیر مسلم بھی اس راز کو محسوس کرتے تھے چنانچہ قسطنطنیہ کے مسیحی بادشاہ نے چوتھی صدی ہجری میں خلیفہ عباسی کے نام جو ایک منظوم خط عربی میں لکھا تھا اس میں وہ کہتا ہے۔

الا شمّروا یا اھلَ بغداد وَیْلَکُم	فَمُلکُکُم مُستَضعَفٌ غیر دائم
فعودوا الی ارض الحجاز اذلّۃً	وخلّوا بلادَ الرّوم اھل المکارم
ملکنا علیکم حین جار قویکم	وَعَامَلتُم بِالمنکراتِ العظائم
قضاتکم باعوا جھارًا قضاءَھُم	کبیع ابنِ یعقوب ببخسِ دراھم

ترجمہ:۔ اے اہلِ بغداد تمہارے لئے تباہی ہے تم بھاگنے کے لئے مستعد ہو جاؤ کیونکہ تمہارا ملک ضعیف اور ناپائدار ہے تم ذلیل ہو کر ارضِ حجاز کی طرف واپس چلے جاؤ اور ذی عزت رومیوں کے شہروں کو خالی کر دو۔ ہم تم پر غالب اس وقت ہوئے جبکہ تمہارے قوی نے ضعیف پر ظلم کیا اور تم اعمالِ شنیعہ کرنے لگے۔ تمہارے قاضی اپنے فیصلوں کو اس طرح بیچنے لگے جس طرح یوسف علیہ السلام چند دراہم میں بیچے گئے تھے۔

خلیفہ عباسی نے ان اشعار کا جواب اس زمانہ کے مشہور عالم اور ادیب قفال مروزی سے لکھوایا

تھا۔ دیکھئے جواب میں کس صفائی کے ساتھ امرِ حق کا اعتراف کیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

وقلتم ملکنا بجور قضاتکم — وبیعہم احکامہم بالدراھم

وفی ذالک اقرار لصحۃ دیننا — وانا ظلمنا فابتلینا بظالم

ترجمہ:۔ تم کہتے ہو کہ ہم (عیسائی) اس وجہ سے تم پر غالب آگئے کہ تمہارے قاضی ظلم کرتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں کو دراہم کے بدلہ میں فروخت کر دیتے تھے ہاں یہ صحیح ہے لیکن اس میں تو ہمارے دین کی سچائی کا اقرار ہے کہ ہم نے ظلم کیا تو ہمارا واسطہ ظالموں سے پڑ گیا۔

سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں محاصرۂ قسطنطنیہ کے ناکام ہونے سے دو سو برس بعد ایک عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کی ناکامی کا جو سبب بتایا تھا یعنی عمال و حکام کا ظلم وجور اور دینِ قیم کے احکام سے انحراف۔ دیکھئے یہ کس طرح مسلمانوں کی پوری تاریخ میں شروع سے آخر تک کارفرما رہا ہے۔ بابر نے ہندوستان پر پے بہ پے حملے کئے مگر جب تک وہ

نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است — بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

پر عامل رہا فتح حاصل نہ کرسکا۔ پھر جب اس نے پیمانہ و سبو کو توڑ کر ان تمام رندانہ بدمستیوں سے توبہ کرلی تو فتح وظفر نے بھی آگے بڑھ کر اس کے قدم چوم لئے۔

یہی سلیمان بن عبدالملک ہے جس کو حسنِ سیرت میں ایک خاص امتیاز کا مالک سمجھا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے جبر و تشدد اور استبداد و انتقام کا یہ عالم ہے کہ اس نے قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم ایسے نامور سپہ سالارانِ اسلام کو ان کی حسنِ خدمات کے باوجود قتل کرادیا اور محض اس بنا پر کہ ان کے متعلق اس بات کا گمان تھا کہ یہ لوگ ولید کے بعد اس کے بیٹے کو خلیفہ بنانے اور سلیمان کو خلافت سے محروم کرنے کی رائے رکھتے ہیں۔ موسیٰ بن نصیر نے بے شبہ اندلس کو فتح کرکے اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دی تھی اور اس بنا پر وہ ہر طرح لائق تحسین و آفرین تھا مگر یہ غریب بھی شاہی عتاب سے

نہ بچ سکا۔ یہاں تک کہ اس کا بیٹا عبدالعزیزؒ تو قتل ہی کر دیا گیا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض بعض عمّال ایسے بھی تھے جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ور اس طرح وہ دربارِ خلافت سے باغی ہو گئے۔ لیکن یہ قصور بھی کس کا ہے؟ جب خلفاء میں استبداد عام ہو جائے پھر عُمّال سے بھی اس قسم کے اعمال کا صدور مستبعد نہیں رہتا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

سلیمان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو چونکہ آپ ملکِ عادل اور خلفاءِ راشدین کے طرز کے خلیفہ تھے اس لئے آپ نے اس حقیقت کو اچھی محسوس کر لیا کہ اصل چیز خود اپنے نفس کا تزکیہ اور اپنے اعمال و افعال کی اصلاح ہے۔ ملکی فتوحات مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ کلمۂ حق عالمگیر ہو اور کوئی طاقت اس کی اشاعت میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس بنا پر آپ نے مسلمۃ بن عبدالملک کو جو اس وقت قسطنطنیہ کی جنگ میں مصروف تھے حکم بھیجا کہ سب مسلمانوں کو لیکر واپس چلے آئیں[1]۔ اور اپنی تمام تر توجہ عُمّال و حُکام اور امراء و وُلاۃ کی اصلاح کی طرف ہی مبذول کر دی اس اصلاح سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ایمان و عمل کے اعتبار سے سچے اور حقیقی مسلمان بن کر زندگی بسر کریں۔ اصلاح کی پہل اپنے گھر سے کی، چنانچہ آپ نے سب سے پہلے خاندانِ شاہی کے افراد کو جمع کر کے اُن سے فرمایا "میرا خیال ہے امتِ مرحومہ کا نصف یا دو تہائی حصہ تم لوگوں کے قبضہ میں ہے تم اسے ان لوگوں کو واپس کر دو جن سے یہ لیا گیا ہے"۔ بنو مروان بھلا اس کو کب ماننے والے تھے بگڑ بیٹھے اور بولے "ہمارے سر قلم ہو جائیں گے لیکن یہ املاک واپس نہیں ہو سکتے۔ ہم نہ اپنے آباواجداد کو کافر بنانا پسند کرتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو مفلس و کنگال"۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تغلُّب اور خیانت کی لعنت کا خاتمہ کر دینے کا عہد کر رکھا تھا فرمایا "خدا کی قسم!

---

[1] طبری جلد ۸ ص ۱۳۰۔

اگر تم ایسا نہیں کروگے تو میں تم کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑ دوں گا" اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے ایک مجمع عام میں یہ تقریر کی۔

"اموی خلفاء نے ہم لوگوں کو ایسی جاگیریں اور جائدادیں دی ہیں جن کے دینے کا اُن کو اور ہم کو ان کے لینے کا کوئی حق نہیں تھا، میں ان سب جاگیروں کو ان کے اصلی حقداروں کے نام واپس کرتا ہوں اور خود اپنی ذات اور اپنے خاندان سے اس کا آغاز کرتا ہوں"

اس تقریر کے بعد آپ نے اپنی کل جاگیر واپس کر دی۔ یہانتک کہ ایک نگینہ بھی نہ رہنے دیا بعض حضرات نے سمجھایا کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کا کیا انتظام ہوگا؟ ارشاد فرمایا "میں ان سب کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں" آپ کی بیوی فاطمہ، عبدالملک کی بیٹی تھیں ان کو باپ نے ایک یاقوت دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا "تم یا تو اس یاقوت کو بیت المال میں داخل کردو، ورنہ مجھ سے ترکِ تعلق کرنے پر آمادہ ہو جاؤ" اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں کو واپس کر دینے کے بعد آپ نے تمام عُمّال و حکام کو بھی تہدیدی خطوط کے ذریعہ تاکید کی کہ وہ تمام مغصوبہ اور بجبر وصول کئے ہوئے اموال کو واپس کر دیں اور آئندہ کے لئے اس طرح کی بے عنوانی کرنے سے مجتنب رہیں۔ آپ کے ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ مال و جائداد اور نقد غرض یہ کہ ایک حبہ بھی جو کسی نے ناجائز طور پر وصول کیا تھا اصلی حقدار کو واپس کر دیا گیا[1]۔ عمالِ بنو امیہ نے طرح طرح کے ناجائز ٹیکسوں اور محصولات کے ذریعہ لوگوں پر ظلم و ستم کے دروازے کھول رکھے تھے آپ نے ان تمام ذرائع آمدنی کو بھی یکقلم بند کرا دیا، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے عبدالحمید عاملِ کوفہ کے نام جو فرمان جاری کیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں

"ظالم عمال کے برے طرزِ عمل اور اللہ کے احکام میں زیادتی کرنے کے باعث اہلِ کوفہ کو سخت ترین مصائب و شدائد کا شکار ہونا پڑا ہے۔ دین کی اساس عدل اور حسنِ سلوک ہے، ویران زمین کا

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۵۲۔

ٹیکس آباد زمین سے نہ لو اور نہ آباد زمین کا ٹیکس ویران زمین سے لو، ویران زمین کو اچھی طرح دیکھو بھالو۔ اور جتنے کی اس میں سکت ہو اس سے وہ خراج لو۔ اور اس کو ٹھیک ٹھاک کرو کہ وہ آباد ہو جائے، پھر آباد زمین سے جو خراج وصول کرو وہ نرمی سے اور زمین کے مالکوں کی سہولت کی رعایت کرتے ہوئے وصول کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ سکہ بنانے والوں کی مزدوری پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ نوروز اور مہرگان کے تحفہ تحائف، قرآن مجید کی قیمتیں، ہاؤس ٹیکس، نکاح خوانی کا معاوضہ ان میں سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کرنی چاہیئے اور یہاں اس کی بھی تاکید جانو کہ جو زمیندار مسلمان ہو جائیگا اس پر خراج واجب نہیں ہوگا۔“ [1]

آپ نے صرف عمال کے نام اس طرح کے فرامین جاری کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب کسی گورنر یا والی کا معاملہ مخدوش نظر آیا آپ نے اس کو فراواقعی سزا دینے میں ذرا رو رعایت نہیں کی، چنانچہ یزید بن مہلب عرب کا نامی گرامی امیر تھا جب وہ مالیہ کی نسبت صفائی پیش نہیں کر سکا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو قید کر دیا اور باوجود لوگوں کی سفارشوں کے اسے رہا نہیں کیا۔ [2]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہ اصلاح نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ تاریخِ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ امتِ مرحومہ کا اصل مرض پہچان گئے تھے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی حکومت کا کوئی گناہ اس سے بڑھکر خطرناک اور تباہ کن نہیں ہو سکتا کہ اس کے عمائد، امراء اور حکام و اراکین رعایا کے اموال میں مطلق العنانی کے ساتھ جا و بیجا تصرف کریں اور کوئی ان سے بازپرس کرنے والا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو فتح ممالک کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی وہ تذکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کو اصلاح ضروری اور سب سے اہم سمجھتے تھے اور اسی پر انھوں نے اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

---

[1] طبری جلد ۸ ص ۱۳۹۔ [2] ابن اثیر الجزری ج ۵ ص ۱۹۔

خلفا بنی امیہ اپنے جبر و تشدد اور خلافتِ راشدہ کے منہاج پر قائم نہ رہنے کے لئے عذر یہ پیش کرتے تھے کہ اب لوگ بھی ایسے نہیں رہے ہیں جیسے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان نے خود ہی خیال صاف لفظوں میں ظاہر کیا تھا۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز ان باتوں کے قائل نہیں تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بادشاہ کی مثال ایک بازار کی سی ہے جس میں وہی چیزیں لائی جاتی ہیں جن کی بازار میں مانگ ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ خود نیک ہوگا تو رعایا بھی نیک ہوگی اور اگر وہ نیک نہیں ہے تو رعایا بھی نیک نہیں ہوسکتی۔

ایک مرتبہ امام اوزاعی نے عباسی خلیفہ منصور کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بادشاہ چار قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو خود بھی ضبطِ نفس کرتا ہے اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید کرتا ہے، یہ بادشاہ درحقیقت اللہ کے راستہ کا مجاہد ہے۔ اس کو ایک نماز کا ثواب ستر ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملیگا، اور اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہمیشہ اس کے سر پر سایہ فگن رہیگا۔ دوسری قسم کا بادشاہ وہ ہے جو خود بھی رعایا کے اموال میں خورد برد کرتا ہے اور اپنے عمال کو بھی اس نے ایسا کرنے کے لئے مطلق العنان چھوڑ دیا ہے یہ بادشاہ سخت ترین گناہگار ہے۔ اس کو اپنے گناہوں کا خمیازہ تو بھگتنا پڑے گا ہی، اس کے عمّال کے گناہ کی بازپرس بھی اس سے ہوگی، تیسری قسم بادشاہ کی یہ ہے کہ خود تو کفِ نفس کرے مگر عمال کو اس نے جبر و تشدد کے لئے آزاد چھوڑ رکھا ہو۔ یہ بادشاہ بڑا ہی بدنصیب ہے کہ دوسروں کی دنیا کے بدلہ میں اپنی آخرت بیچتا ہے۔ چوتھی قسم کا بادشاہ وہ ہے جو خود تو بہت ہی غیر محتاط ہے مگر عمال کو محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے، امام اوزاعی نے فرمایا:۔

فذالک شر الاکیاس "یہ تو بہت ہی بری فرزانگی ہے"

امام اوزاعی کی اس تقسیم کے مطابق کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا شمار پہلی قسم کے بادشاہوں میں ہے۔ آپ نے خود بھی ورع و تقویٰ اور احتیاط و پرہیزگاری کی زندگی بسر کی

اور اپنے عمال کو بھی مجبور کیا کہ وہ شریعتِ اسلام کے مطابق ہی لوگوں سے معاملہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کو علیٰ منہاج الخلافۃ الراشدہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی معدلت گستری، حق پسندی اور پاک باطنی اس درجہ روشن تھی کہ اپنے تو اپنے بیگانے اور پرائے تک آپ کی ان صفات و خصائص کا اعتراف کرتے تھے، مسعودی کا بیان ہے کہ قیصرِ روم کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خبرِ وفات پہنچی تو اُسے سخت ملال ہوا۔ بار بار خلیفۂ مرحوم کے محاسن و مناقب کا ذکر کرتا تھا اور روتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ اسی سلسلے میں اس نے کہا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے بعد کوئی شخص مردوں کو زندہ کر سکتا تو میں عمر بن عبد العزیز کے متعلق گمان کرتا کہ وہ یہ معجزہ دکھا سکتے ہیں۔ آخر میں کہا "میں اس راہب کو پسند نہیں کرتا جو دنیا کے تمام تعلقات کو منقطع کر کے کسی ایک گرجا میں گوشہ نشین ہو کر خدا کی عبادت کرتا ہے بلکہ میں اس راہب (حضرت عمرؒ کی طرف اشارہ ہے) کو دیکھ دیکھ کر ہمیشہ تعجب کرتا تھا جو اپنے قدموں کے نیچے دنیا جہان رکھتا تھا اور پھر بھی راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔"[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت تمام مفاسد و ذمائم سے پاک و صاف ہو کر پھر اپنی اسی اصلی شکل و صورت کے ساتھ قائم ہو جائے لیکن افسوس کہ آپ کا عہدِ خلافت بہت ہی مختصر تھا

یزید بن عبد الملک | آپ کے بعد یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا مگر وہ اس روش کو برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے کچھ دنوں بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مقرر کئے ہوئے عُمّال کو یکقلم معزول کر دیا اور اپنے عُمّال کو صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ "عمر بن عبد العزیز کی جو پالیسی تھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتی، ان کے طرزِ عمل سے خراج اور ٹیکس کی مقداریں بہت کمی آگئی ہے۔ اس لئے تم لوگ پھر اسی دورِ قدیم کا سا معاملہ کرنا شروع کر دو۔ اس میں لوگ سرسبز و شاداب رہیں یا قحط زدہ ہو جائیں، اس طرزِ عمل کو پسند کریں یا ناپسند، بہرحال تم کسی بات کی پروانہ کرو۔"

[1] مروج الذہب برحاشیہ ابنِ اثیر ج ۷، ص ۱۲۰-۱۲۱۔

علاوہ ازیں یزید بن عبدالملک انتہا درجہ عیش پسند اور آرام طلب تھا۔ سلامہ اور حبابہ اس کی محبوب ترین کنیزکیں تھیں، ان میں سے حبابہ کے ساتھ عشق و محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی سے حادثہ سے حبابہ کا انتقال ہوگیا، یزید نے تین روز تک اُس کی نعش کو بے گور و کفن اپنے پاس محل میں ہی رکھا اس حالت میں وہ بار بار نعش کو بوسہ دیتا اور پیار کرتا اور فرطِ درد و کرب سے چیختا چلاتا تھا۔[1] بعض مورخین کا بیان ہے کہ یزید کی موت کا سبب بھی یہی حادثہ جانکاہ تھا۔ غرض یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دو سال چند ماہ کی مختصر ترین مدت میں نظامِ خلافت کے جن مفاسد کی اصلاح کی تھی وہ دنیا سے آپ کے رخصت ہوتے ہی پھر رونما ہونے لگے اور حق تو یہ ہے کہ مسلسل غلط کاریوں کے باعث جو زہر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی رگوں میں سرایت کر گیا تھا اس کو اب خارج کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔

ہشام بن عبدالملک چار سال ایک ماہ کی خلافت کے بعد شعبان ۱۰۵ھ میں یزید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا تو اس کی وصیت کے مطابق اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک سریر آرائے خلافت ہوا۔ ہشام فہم و تدبر اور سیاست و فرزانگی میں ایک خاص امتیاز کا مالک تھا۔ اس حیثیت سے خلفاءِ بنی امیہ میں اس کو وہی مقام حاصل ہے جو امیر معاویہ اور عبدالملک بن مروان کو حاصل تھا۔ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں بڑا محتاط تھا یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس پر بخل کا دھوکہ ہوتا تھا۔ مال جمع کرنے کا شوق ضرور تھا۔ عُمّال کے متعلق اس کی روش تقریباً وہی تھی جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تھی۔

مورخین کا بیان ہے کہ ٹیکس اور خراج وغیرہ کی رقوم کے وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا جتنا اچھا نظام ہشام بن عبدالملک کے عہد میں تھا کسی اور خلیفہ کے عہد میں نہیں تھا۔ ان تعمیری اور انتظامی کارناموں کے علاوہ فتوحات کے اعتبار سے بھی ہشام کا زمانہ بنی امیہ کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے

[1] ابن اثیر ج ۵ ص ۴۵۔

اس کے عہد میں پھر خوارج نے سر اٹھایا تھا۔ اس نے سرکوبی کر کے ان کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔ سندھ محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا مگر یہاں کے بعض علاقوں میں پھر بغاوت و سرکشی کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ ہشام نے اپنے نامی گرامی سپہ سالار فوج جنید کو بھیجکر ان بغاوتوں کا استیصال کرایا۔ ایشیاء کوچک میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ اندلس میں انتظامی اعتبار سے جو بعض خرابیاں پیدا ہو چلی تھیں ان کی اصلاح کر کے وہاں کی فضا کو ہموار کیا، شمالی افریقہ کی بربر قوم حسب عادت پھر سرکش ہو گئی تھی اس کی طاقت کو زیروزبر کیا۔ فرانس پر متعدد حملے ہوئے۔ غرض یہ ہے کہ اسلام کی سیاسی طاقت و مرکزیت کو متعدد اسباب و وجوہ سے جو خطرات لاحق ہو گئے تھے ہشام نے اپنی فہم و فراست، عزم و حزم اور ہمت و حوصلہ سے کام لیکر ان کا مقابلہ انتہائی پامردی اور عالی حوصلگی کے ساتھ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اپنی سیاسی عظمت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہ سکے۔ پھر چونکہ ہشام عملی لحاظ سے خود بھی رند مشرب یا لاابالی مزاج نہیں تھا اور مذہبی تعلیم و تبلیغ کا اہتمام بھی کافی کرتا تھا، علماء اور فقہا کا قدردان تھا اس بنا پر سیاسی عظمت و برتری کے ساتھ دین قیم کے عقائد و احکام کی اشاعت بھی وسیع پیمانہ پر ہوتی رہی۔

ہشام اسلام کے عقائد صحیحہ کے بارہ میں کسی قسم کی مداہنت کا روادار نہ تھا کوئی شخص اگر ان کے خلاف اپنے عقائد فاسدہ کی تبلیغ کرتا تھا تو اسے دربار خلافت سے شدید ترین سزا دیجاتی تھی تاکہ دوسرے لوگوں کے لئے سرمایۂ عبرت ہو اور انھیں اپنے خیالات پھیلا کر مسلمانوں میں دماغی پراگندگی پیدا کرنے کی جراءت نہ ہو۔ خلق قرآن کا فتنہ سب سے پہلے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ ہشام نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ اس فتنہ کے بانی جعد بن درہم کو قید کر کے عراق کے امیر خالد بن عبداللہ القسری کے پاس بھیجدیا اور لکھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ خالد نے اس میں کچھ تساہل سے کام لیا۔ ہشام نے پھر دوبارہ لکھا اور سخت تاکید کی کہ جعد کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے عین بقرعید کے دن عید

کی نماز کے بعد جعد کی گردن اڑادی [۱]

اسی طرح غیلان بن یونس ایک شخص تھا جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں قدریہ عقائد کا اظہار کرتا تھا۔ حضرت عمرؒ نے اس کو بلواکر توبہ کرائی تھی مگر ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں اس شخص نے پھر اپنے عقائد فاسدہ کا اظہار شروع کردیا تھا ہشام نے اپنے حکم سے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوادیے [۲]

لیکن ہشام کو بنوامیہ کا آخری خلیفہ سمجھنا چاہیے جس نے اسلام کی سیاسی مرکزیت کو اپنی سیاست وتدبیر کے مضبوط ہاتھوں سے تھامے رکھا اس کی مدتِ حکومت پندرہ سال ہے۔ اس کے بعد آخری خلیفہ مروانِ ثانی تک جتنے خلفاء ہوئے ان میں کوئی یا تو بالکل ہی نالائق اور نااہل تھا، یا ذاتی اوصاف کے لحاظ سے تو نیک تھا مگر اس میں سیاست وتدبیر اور ہمت وجرأت کا فقدان تھا۔ جس کے باعث وہ وقتی اور ہنگامی شورشوں کا سدباب نہ کرسکا۔ چنانچہ ہشام کے بعد یزید بن عبدالملک کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا جس کو یزید خود اپنی زندگی میں ولیعہد بنا گیا تھا، یہ پرلے درجہ کا فاسق وفاجر اور ظالم وجابر تھا، بادۂ رنگیں اور نغمۂ شیریں کے علاوہ اس کو کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا، ہشام اس کی رندانہ بدمستیوں کو دیکھکر چاہتا تھا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو اپنا جانشین بنادے لیکن ایسا نہ ہوسکا اس بنا پر ولید نے ہشام کے بعد اس کی اولاد اور اس کے عمّال وحکام سے شدید انتقام لیا، متعدد بااثر اصحاب قتل کیے گئے۔ مضر اور نزار کے قبیلوں کی باہمی آویزش جو مدہم پڑگئی تھی پھر تازہ ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد ۱۲۶ھ میں یعنی ولید کی تخت نشینی سے ایک سال بعد یزید بن ولید تخت نشین ہوا۔ یہ خود عبادت گذار تھا مگر انتظامی قابلیت کم تھی۔ اسی لئے اس کو یزید الناقص کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی مخالفتوں اور بغاوتوں کا ایک کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا عرب کے مضری قبائل اس کے سخت مخالف تھے انھوں نے شورش برپا کردی۔ ادھر حمص اور فلسطین

---

[۱] ابن اثیر الجزری ج ۵ ص ۹۶۔ [۲] ابن اثیر ج ۵ ص ۹۷۔

میں بغاوت کے شرارے بلند ہوئے اگرچہ عارضی طور پر ان کا تدارک کیا گیا لیکن ان کا استیصالِ کلی نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آخری خلیفہ مروان ثانی کے عہد میں یہ ہی چیزیں جو قطرہ قطرہ ہو کر جمع ہو رہی تھیں ایک سیلابِ بلا بن کر امنڈ پڑیں اور اموی حکومت کے جاہ و جلال کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئیں۔

مورخ طبری کا بیان ہے کہ مروان سن رسیدہ اور تجربہ کار تھا اس کے علاوہ حزم و دور اندیشی سے بھی بے بہرہ نہ تھا لیکن بدنصیبی سے اس کو تختِ حکومت اس وقت ملا جبکہ ملک میں عام بدنظمی اور شورش بپا تھی۔ ایک طرف خود اموی خاندان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ شام میں متعدد سیاسی پارٹیاں تھیں جو باہم دست و گریباں تھیں۔ ادھر خراسان عباسی دعوت کا مستقر اور مرکز بنا ہوا تھا اس تحریک کو اب اور بھی ابھرنے اور بروئے کار آنے کا موقع مل گیا۔ خوارج یمن میں اپنی منتشر طاقتوں کو جمع کر رہے تھے یہ صورتِ حال دیکھ کر ان کو بھی یہ حوصلہ ہوا کہ یمن سے نکل کر مکہ اور مدینہ میں اپنے عقائد کی دعوت و تبلیغ شروع کر دی۔ مروان نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک لشکرِ جرار روانہ کیا جس نے حجاز میں اور یمن میں گھس کر ان سے شدید جنگ کی اور ان کے ہزاروں آدمیوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ عباسی دعوت کا ہیرو اور سپہ سالار ابو مسلم خراسانی تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ بنو امیہ کی بہت بڑی طاقت خوارج سے جنگ کرنے میں مشغول ہے تو ایک لاکھ انسانوں کی منظم فوج جمع کر کے پہلے خراسان پر با قاعدہ قبضہ کیا۔ اس کے مختلف علاقوں کا انتظام اپنے متعدد لوگوں کے سپرد کر دیا۔ پھر قحطبہ نامی ایک بہادر جرنیل کی کمان میں ایک لشکرِ گراں عراق عجم کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اموی حکومت کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اس لئے رے، اصفہان اور نہاوند وغیرہ مقامات پر معمولی لڑائیوں کے بعد قحطبہ کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ موصل اور اربل کے درمیان نہرِ زاب اعلیٰ کے کنارہ پر مروان خود ایک فوجِ گراں لئے پڑا تھا۔ یہاں دونوں میں گھمسان لڑائی ہوئی۔ مروان شکست کھا کر بھاگا۔ شام کے لوگوں سے

بہت کچھ توقعات تھیں مگر ان لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ اس کی شکستہ حالی کو دیکھکر اور الٹا اثر یہ ہوا کہ جہاں جہاں اس کی حکومت کے معاون و مددگار رہتے تھے قتل کر دیئے گئے چنانچہ مصر والوں نے اپنے گورنر کو اور اہلِ حمص نے گورنرِ حمص کو سپردِ تیغ کر دیا۔ اہلِ مدینہ نے کم از کم یہ کیا کہ مروان کے مقرر کیئے ہوئے عامل کو قتل نہیں بلکہ صرف مدینہ سے نکال باہر کیا۔ غرض کہ زمین کی وسعتیں اس پر تنگ ہوگئی تھیں۔ نزاری جن پر اس کو بڑا اعتماد تھا وہ بھی بے مروتی کر رہے تھے، محروم و مایوس ہو کر دمشق اور فلسطین ہوتا ہوا مصر پہنچا۔ عباسی لشکر پیچھے سے تعاقب میں آہی رہا تھا۔ یہاں مروان نے چند ساتھیوں کے ساتھ پھر کچھ مقابلہ کیا مگر یہ مقابلہ ایک مرغِ بسمل کی پَر افشانی سے زیادہ وقیع نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مارا گیا اور اس کے مٹتے ہی اموی حکومت کا چراغ بھی ۱۳۲ھ میں گل ہو گیا۔

بنو امیہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ اسلام کی حقیقی روح کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ کس طرح اس کے عروج کے اسباب بھی بہم پہنچتے رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہانتک ایمان اور عمل کے حقیقی معیار کا تعلق ہے اس دور کے مسلمانوں کو عہد صحابہ کے مسلمانوں کے ساتھ بحیثیت مجموعی کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ اگر اس عہد کے مسلمانوں کا بحیثیت ایک قوم کے دنیا کی دوسری متمدن قوموں کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو یہ بات صاف نمایاں ہوگی کہ مسلمان اپنے عقائد و افکار، اعمال و اخلاق، معاشرت و معاملات کے اعتبار سے اب بھی دنیا کی بہترین قوم تھے۔ ان میں اسلام کی واقعی روح مضمحل تھی مگر مردہ نہیں ہوئی تھی۔ ان کی حیرت انگیز جانبازیوں میں کچھ نہ کچھ دنیا طلبی کا دخل ہو تو ہو مگر ساتھ ہی اعلاءِ کلمۃ اللہ کے جذبہ سے بے بہرہ نہ تھے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر مسلمانوں میں وحدتِ اجتماعی نہ ہوتی تو ان کو چین، ہندوستان، افریقہ، اور اندلس میں وہ شاندار کامیابیاں ہرگز نہیں ہوسکتی تھیں جو انھوں نے حاصل کیں اور اس وحدت اجتماعی کا

دارومدار کسی قبائلی یا خاندانی رشتہ پر نہیں تھا بلکہ اسلام کے اس تعلق پر تھا جس نے افریقہ اور چین کے مسلمانوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا تھا۔

خلفاءِ بنو امیہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تہذیب کو خالص عربی تہذیب رکھا۔ ایرانی، یونانی، ترک اور تاتار، ہندی اور چینی غرض یہ کہ دنیا کی مختلف قومیں مسلمان ہو ہو کر عربوں کے ساتھ رہنے سہنے لگی تھیں۔ لیکن عربوں کی تہذیب نے نومسلم قوموں کو متاثر کیا۔ خود عرب ان کی تہذیب سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت بھی عالمگیر ہوتی رہی اور جہاں جہاں مسلمانوں کا پرچم فتح و نصرت لہرایا وہاں مسجدیں تعمیر ہو کر آباد ہوئیں، حق کے غلغلوں سے وہاں کی فضا گونج اٹھی اور تمام لوگ اسلامی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگے گئے قرآن کی زبانِ عربی کو فروغ ہوا۔ تمام ممالکِ محروسہ میں قرآن و حدیث کے درس کیلئے مکاتب قائم ہوئے

عہدِ بنی عباس

خراسانیوں کے گرزِ البرز شکن نے بنو امیہ کے قصرِ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو اس کے کھنڈروں پر خلافتِ بنی عباس کی شاندار عمارت قائم ہوئی یہ عمارت شاید اس وقت تک مضبوط اور پرہیبت و جلال نہیں ہو سکتی تھی جبتک کہ اس کی مٹی کو بنی امیہ کے خون سے نہ گوندھا جاتا اور اس کی بنیاد بیشمار انسانوں کے سروں اور ان کے اعضاءِ بریدہ پر نہ رکھی جاتی۔

دردناک مظالم | نہر زاب کے کنارہ پر اموی اور خراسانی لشکروں کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اس کے علاوہ عراق اور خراسان کے دوسرے مقامات پر بیشمار انسانوں کا خون بہایا گیا مگر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی۔ مروان مصر کے ایک مقام بوصیرہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل ہونے سے پہلے ہی کوفہ میں بماہِ ربیع الاول ۱۳۲ھ خاندانِ بنو عباس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح کے لئے بیعت لے لی گئی تھی مگر ان لوگوں کی آتشِ انتقام پھر بھی سرد نہیں ہوئی اور بنو امیہ کے ایک ایک آدمی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کر دیا گیا۔ سفاح کے چچا داؤد بن علی نے مکہ اور مدینہ میں اور

عبداللہ بن علی نے شام میں اموی خاندان کے یا اس خاندان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے جس کسی شخص کو پایا بے دریغ سپردِ تیغ کردیا۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ابن اثیر الجزری کا بیان[1] ہے کہ سلیمان بن علی گورنر بصرہ نے تو یہاں تک کیا کہ بہت سے اموی جو بیش قیمت لباس زیب تن کئے ہوئے تھے ان کو بصرہ میں قتل کرایا، اور اس کے بعد پیروں میں رسیاں بندھوا کران کی بے گوروکفن نعشوں کو شاہراہِ عام پر ڈلوادیا جہاں ان کے جسم کتوں کے لئے سامانِ ضیافت بنے۔ عبداللہ بن علی کی آتشِ انتقام زندہ انسانوں کے قتل کرنے سے نہ بجھی تو اس نے بنوامیہ کے جلیل القدر خلفاء امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان اور ہشام بن عبدالملک تینوں کی قبریں کھدوائیں۔ ہشام کی نعش بجز اس کی ناک کے بانسہ کے بالکل صحیح سالم تھی۔ اس کو کوڑوں سے پٹوایا۔ ابن اثیر نے بنوامیہ پر مظالم کے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعات لکھے ہیں جن کو پڑھکر انسانیت اور شرافت لرزہ براندام ہوجاتی ہیں یہاں ان کو بیان کرنا چنداں ضروری نہیں ہے۔

جوشِ انتقام میں ان لوگوں کا توازنِ دماغی کس درجہ معطل ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام بن عبدالملک بیٹھا ہوا تھا اور سفاح اس کے ساتھ تعظیم وتکریم کا معاملہ کررہا تھا۔ اتنے میں سدیف نامی ایک شاعر آیا اور اس نے ذیل کے دو شعر پڑھے ؎

لا یغرنك ما تری من رجال — ان تحت الضلوع داء دویا

فضع السیف وارفع السوط حتی — لا تری فوق ظهرها امویا

ترجمہ:۔ اے سفاح تجھکو یہ لوگ جنھیں تو دیکھ رہا ہے کہیں دھوکہ میں مبتلا نہ کردیں، ان کی پسلیوں میں چھپی ہوئی بیماریاں ہیں یعنی ان کا دل صاف نہیں ہے۔ تو تلوار سے کام لے اور کوڑا اٹھا یہاں تک کہ زمین کی پشت پر ایک اموی کو بھی زندہ نہ چھوڑ"

---

[1] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۱۶۵ تا صفحہ ۱۶۲۔

ان اشعار کو سنتے ہی سفاح محل میں چلا گیا اور اس کے بعد ہی سلیمان کو پکڑ قتل کر دیا گیا پھر بنوامیہ پر ہی کیا موقوف ہے جن لوگوں پر آلِ علی کی حمایت اور ان کی طرفداری کا شبہ تھا ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اس شاندار حکومت کا آغاز ہوا جس کے عہد کو مسلمانوں کی تاریخ کا "عہدِ زریں" کہا جاتا ہے اور جس پر ہمارے مورخین فخر کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے

سفاح کا قول و عمل

بیعتِ خلافت کے وقت ابوالعباس سفاح نے جامع کوفہ میں جو خطبہ دیا تھا اس میں اس نے بڑے فخر سے کہا تھا "اللہ نے اپنے دین کو ہمارے ذریعہ مضبوط کیا اور ہم کو اس کا قلعہ اور پناہ گاہ بنایا۔ ہم اس دین کی حفاظت کرنے والے اور اس کے لئے دشمنوں سے لڑنے والے ہیں اللہ نے ہم کو تقویٰ اور طہارت کا پابند بنایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا شرف عطا فرما کر ہم کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مستحق خلافت کیا ہے"۔ اس کے بعد سفاح نے قرآن مجید کی چند آیات پڑھیں جن میں ذوی القربیٰ کے حقوق کا ذکر ہے۔ پھر بنوامیہ اور اہلِ شام پر سب و شتم کیا اور رنگین بیانی سے کام لیکر ان کو خلافت کا غاصب اور انتہائی ظالم و جابر ثابت کیا عجیب بات یہ ہے کہ وہی اہلِ کوفہ جنھوں نے جگر گوشۂ رسول امام حسینؓ کے ساتھ بیوفائی کی جو ان کی مظلومانہ شہادت کا سبب بنی۔ سفاح ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ "اے اہلِ کوفہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب ہماری محبت اور مودت کا مرکز ہو اور تم وہی ہو کہ زمانہ کے حوادث اور ظلم و جبر کی فراوانیاں بھی تم کو ہم سے برگشتہ نہیں کر سکیں اور ہمارے متعلق تمہارے رویہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اس لئے تم ہمارے نزدیک سب سے زیادہ سعادتمند اور معزز و مکرم ہو۔ اور میں نے آج سے تمہارے عطیات میں سو سو درا ہم کا اضافہ کر دیا ہے۔ خطبہ کے آخر میں اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "فانا السفاح المبیح والثائر المنیح" میں خون کو مباح سمجھنے والا خونریز ہوں اور شدید انتقام لینے والا ہوں"۔

ابوالعباس سفاح اس وقت تپ زدہ ہو رہا تھا اس سے زیادہ نہ بول سکا اور یہاں تک تقریر

کرکے گھر میں چلا گیا۔ اس کے بعد سفاح کا چچا داؤد بن علی منبر پر آیا اور اس نے ایک طویل تقریر کی۔ اس تقریر میں کئی جگہ داؤد نے کہا۔۔۔ کہ خلافت ہمارا حق ہے جو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور میراث ہم کو پہنچا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اس حق کو غصب کرنیوالے ہلاک ہوگئے اور یہ حق پھر ہم کو واپس مل گیا داؤد نے صرف اسقدر کہنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس نے پوری جرأت اور ڈھٹائی سے یہانتک کہدیا "تم سب لوگ اچھی طرح سن لو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے اب تک بجز امیر المومنین حضرت علیؓ اور امیر المومنین عبداللہ بن محمد یعنی ابو العباس سفاح کے اس منبر پر کوئی صحیح معنی میں خلیفہ بیٹھا ہی نہیں ہے"۔

اب ذرا ایک طرف سفاح اور داؤد بن علی ان دونوں کے خطبات کو پڑھیے اور دوسری جانب ان کا عمل دیکھیے اور پھر بتایئے کہ اسلام میں غدر، فریب، جھوٹ اور مکاری و بے ایمانی کی مثال کوئی اس سے بھی بدتر ہو سکتی ہے؟ دعوی یہ ہے کہ ہمارے برابر کوئی خلیفہ برحق ہوا ہی نہیں، یہانتک کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بھی خلیفہ نہیں تھے لیکن عمل ہو بہو اس شعر کا مصداق ہے۔

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے   کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنی اس بدقسمتی پر روئیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لیگئے ابھی پورے سوا سو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیاد محض جوشِ انتقام، عربوں سے نفرت و عداوت اور خود غرضی پر قائم تھی اور اس بنا پر اس کو قائم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کیلئے وہ سب کچھ کیا گیا جو اسلامی شریعت میں ناجائز و ناروا تھا۔ عربی کی ایک مثل کے مطابق بنو امیہ اگر نبّاش اول (پہلے گورکن) تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ بنو عباس نباش ثانی (دوسرے گورکن) تھے اور اس لئے موخر الذکر کے مقابلہ میں اول الذکر بہرحال رحمۃ اللہ علی النباش الاول کے مستحق تھے۔

سعید الفطرت وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں سے عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں مگر بنو عباس نے ایسا نہیں کیا۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بنو امیہ کے زوال میں دو چیزوں کو بہت بڑا دخل ہے، ایک حد سے زیادہ جبر و تشدد ظلم و جور اور سفاکی و بے رحمی اور دوسرے خلیفہ کا اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو بلکہ تین تین کو اپنا ولیعہد بنانا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بھی اپنا رویہ یہی رکھا۔ اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

ولی عہد بنانے کے ہولناک نتائج

متوکل باللہ کے زمانہ تک خلفاء کا دستور یہی رہا کہ وہ اپنی حیات میں ہی اپنی اولاد میں سے کسی کو یا بھائی اور بھتیجہ کو یا دونوں کو یکے بعد دیگرے اپنا ولیعہد بنا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قصرِ خلافت میں زہر خورانی کے واقعات پیش آتے تھے۔ باہمی سازشیں ہوتی تھیں۔ یہانتک کہ سخت ترین جنگ و جدال کی نوبت بھی آجاتی تھی اور اس طرح اعزا و اقربا رآپس میں میل ملاپ اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے اور اس سے شاہی محلات کی زندگی کے ابتر اور پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ رعایا کی زندگی بھی ایک عجیب کشمکش میں بسر ہوتی تھی انتہا یہ ہے کہ اس طرزِ عمل سے بعض اوقات باپ اور بیٹوں تک میں شرمناک واقعات پیش آجاتے تھے جن کا کوئی مسلمان تو کیا ایک معمولی درجہ کا انسان بھی تصور نہیں کرسکتا۔

متوکل باللہ عباسی کے متعلق صاحب شذرات الذہب کا بیان ہے۔

وھوالذی احیا السنۃ وامات التجھم اس نے سنت کو زندہ کیا اور جہمیت کو فنا کیا۔

لیکن اس محی سنت کا بھی حال یہ تھا کہ اس نے پہلے تو اپنے تین لڑکوں منتصر، معتز اور موید کو اپنا ولیعہد مقرر کردیا لیکن چونکہ معتز کی ماں سے جو صبیحہ نام کی ایک لونڈی تھی محبت زیادہ کرتا تھا اس لئے بعد میں اس کی رائے ہوئی کہ منتصر سے ولیعہدی سے علیحدگی کا اقرار نامہ لکھالے اور اس کے بجائے معتز کو اپنا قائم مقام بنادے۔ منتصر نے اس کو گوارا نہ کیا اور غیظ و غضب کی آگ نے برافروختہ

ہوکر اس کو باپ کے قتل کر دینے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ شوال ۲۴۷ھ میں متوکل اپنے وزیر فتح بن خاقان کے ساتھ بیٹے کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ جس بیٹے کا اپنے باپ کے ساتھ یہ سلوک ہو وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا کم تھا باپ کو قتل کرنے کے کچھ دنوں بعد منتصر نے اپنے دونوں بھائیوں کو مجبور کیا کہ ولیعہدی سے الگ ہو جائیں۔ معتز نے کچھ مخالفت کی مگر آخر کار موید اور معتز دونوں کو منتصر کا حکم ماننا پڑا۔

ترک غلاموں کا اقتدار

متوکل کی موت کے بعد خلافت بنی عباس کا پورا اقتدار ترک غلاموں کے ہاتھ میں آگیا تھا وہ جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جب اس سے ناراض ہوتے اُسے الگ کر دیتے بلکہ نہایت وحشیانہ طریقہ پر طرح طرح کی ایذائیں دیکر قتل کر دیتے تھے، چنانچہ متوکل باللہ سے لیکر آخری خلیفہ تک جتنے خلفاء ہوئے ان میں ایک کثیر تعداد ان خلفاء کی ہے جن کو ترک غلاموں نے تختِ سلطنت پر بٹھایا اور آخر کار نہایت بے دردی کے ساتھ ان کا خاتمہ کر دیا۔ خود متوکل منتصر کے ایما سے ترک غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اسی طرح ان غلاموں نے مستعین باللہ المتوفی ۲۵۲ھ کو کچھ دنوں قید رکھا پھر گردن اڑادی۔ معتز باللہ کو ۲۵۵ھ میں جبکہ وہ حمام میں نہا رہا تھا کھولتے ہوئے پانی میں غوطہ دیکر مار ڈالا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ایک تہ خانہ میں بند کر کے تہ خانہ کو اوپر سے بند کر دیا اور معتز اسی میں دم گھٹ جانے سے مر گیا۔ ۲۵۶ھ میں مہتدی کو انھیں بے رحموں نے نشانۂ ظلم وستم بنایا اور تھپڑ اور لاتیں مار مار کر اسے جان بحق کر دیا۔ ۲۹۶ھ میں ابن المعتز کو گلا گھونٹ کر انھیں ظالموں نے شہید کیا مقتدر باللہ کو اس وحشیانہ طریقہ پر قتل کیا کہ پہلے تلوار سے گردن اڑادی پھر سر کو نیزہ پر اٹھا کر اس کی نمائش کی اور تمام جسم عریاں کر دیا۔ قاہر باللہ کی آنکھوں میں ایک آگ میں تپتی ہوئی سلاخ پھیری اور اس طرح اسے تڑپا تڑپا کے ختم کیا۔ اسی طرح خلیفہ مستکفی باللہ المتوفی ۳۳۴ھ کے پاؤں میں رسی باندھ کر اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور پھر آنکھوں میں لوہے کی سلاخ ڈالکر اس کا خاتمہ کر دیا۔ متقی باللہ

کے ساتھ بھی اسی قسم کا معاملہ ہوا۔ خلیفہ مسترشد باللہ پر اچانک سترہ آدمیوں نے چاقوؤں سے حملہ کر کے اس کے جسم کو پارہ پارہ کر دیا اور ناک کان کاٹ کر انھیں آگ میں جلا دیا۔ راشد باللہ کو اس کے بیٹے کے ساتھ بہت دنوں تک قید میں رکھا۔ یہاں تک کہ پھر دونوں قید خانہ میں ہی جان بحق ہو گئے۔ پھر سب سے آخر میں خلیفہ مستعصم باللہ کا جو حشر ہوا اس کو سنکر بھی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ وزیر ابن علقمی کی سازش سے تاتاریوں نے اس کو گرفتار کیا اور ایک تھیلہ میں بند کر کے اس کو روندڈالا گیا اور اسی پر خلافت بنی عباس کا چراغ جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

خلافتِ عباسیہ کے دو دور

عہد بنی عباس کو تاریخی طور پر دو دوروں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جو تاریخ کی عام زبان میں اس خلافت کا عہد زریں کہلاتا ہے ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر معتصم باللہ کے آخر عہد حکومت ۲۲۷ھ تک ممتد ہے۔ اس کے بعد سے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جو ۶۵۶ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے بغداد میں قتل ہونے پر منتہی ہو جاتا ہے۔

دورِ انحطاط

یہ آخری دور عباسیوں کا دورِ انحطاط ہے جس میں دربارِ خلافت کا اقتدار تقریباً بالکل ختم ہو گیا تھا۔ غلاموں، خواجہ سراؤں اور عورتوں کا عمل دخل امورِ سلطنت میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اندرونِ ملک شورشیں برپا تھیں۔ مختلف صوبوں میں طوائف الملوکی اور خود مختاری پیدا ہو چلی تھی۔ یہاں تک کہ راضی باللہ (از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ) کے عہد میں خلیفۂ اسلام محض نام کا خلیفہ رہ گیا۔ مختلف صوبوں میں خود مختارانہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ بصرہ میں ابن رائق۔ خوزستان میں بریدی، فارس میں عماد الدولہ بن بویہ۔ کرمان میں ابو علی بن الیاس۔ رے، اصفہان اور جبل میں رکن الدولہ بن بویہ اور وشمگیر بن زیاد موصل اور دیار بکر و ربیعہ و مضر میں بنو حمدان، مصر اور شام میں اخشید، مغرب اور افریقہ میں قائم علوی۔ اندلس میں عبد الرحمٰن بن محمد الاموی۔ خراسان اور ماوراء النہر میں نصر بن احمد بن سامان۔ طبرستان اور جرجان میں، دیلم، بحرین اور یمامہ میں ابو طاہر القرمطی اپنی اپنی مستقل حکومتیں قائم کر کے بیٹھ گئے اور

خلافت صرف ایک دینی رسم ہو کر رہ گئی۔ اب خلیفہ بغداد اور اس کے اطراف و اکناف کے علاوہ کسی اور حصۂ ملک کا مالک نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بغداد میں بھی وہ پورے طور پر آزاد نہیں تھا۔ صوبوں کی خود مختار حکومتیں مسلمانوں میں اپنا وقار قائم کرنے کے لئے دربارِ خلافت سے کچھ نہ کچھ وابستگی ضرور رکھتی تھیں اور کوئی سلطان خلیفۂ بغداد سے سندِ سلطانی حاصل کئے بغیر سلطنت نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ خلفاء ان سلاطین سے جتنا ڈرتے تھے خود سلاطین ان سے اس قدر خوف نہیں کھاتے تھے۔ اس بنا پر کسی صوبہ کا خود مختار گورنر جو چاہتا تھا خود اپنے اثر و رسوخ سے یا خلیفہ کے کسی غلام، خواجہ سرا۔ یا کسی لونڈی کی سفارش سے دربارِ خلافت سے اس کی منظوری حاصل کر لیتا تھا۔

امورِ سلطنت میں عجمی غلاموں کا یہ عمل دخل منصور کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا، اگر معاملہ غلاموں کو سرکاری عہدے دینے تک ہی محدود رہتا اور ان کے اعزاز و اکرام کے ساتھ خالص اسلامی طریقہ پر ان کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام رکھا جاتا تو خلافت ان کے ہاتھوں تباہ نہ ہوتی بلکہ اس میں اور استحکام پیدا ہو جاتا۔ خلفاء بنی عباس کی طرح سلطان علاء الدین خلجی اور فیروز شاہ کی ملکیت میں بھی پچاس پچاس ہزار غلام رہتے تھے جو فوجی محکمہ اور سلطنت کے دوسرے شعبوں میں چھائے ہوئے تھے۔ لیکن یہ چونکہ ایک خاص قسم کی تربیت پائے ہوئے تھے اس لئے ان غلاموں کا وجود حکومت کے لئے خطرناک ہونے کے بجائے بہت کچھ تقویت اور مضبوطی کا سبب تھا۔ شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ "فیروز شاہ اپنے غلاموں سے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کام لیتا تھا جو غلام سیاسی خدمات انجام دینے کے اہل تھے ان کو سلطنت کے مختلف شعبوں میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اور جو غلام علمی اور تعلیمی کاموں سے طبعی مناسبت رکھتے تھے ان کو اسکولوں اور کالجوں میں داخل کر کے مختلف علوم و فنون کی اور دینیات کی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ بعض بعض غلاموں کو مکہ معظمہ بھیجدیا جاتا تھا کہ وہ ارضِ مقدس میں دنیوی علائق سے یکسو ہو کر ہمہ تن زہد و عبادت میں مشغول رہیں۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۸، ۲۷۳)

لیکن خلفاء بنی عباس کا حال سلاطین دہلی کے برعکس تھا۔ انھوں نے نہ تو غلاموں کی اخلاقی تعلیم و تربیت پر توجہ کی اور نہ ان پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے کے باعث ان کی اندرونی سرگرمیوں سے واقف رہنے کی کوشش کی۔ پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف رفتہ رفتہ سلطنت کے ذمہ دارانہ عہدے اور مناصب عجمیوں بلکہ ترک غلاموں کے قبضہ میں آرہے تھے جن کے دلوں میں اسلامی تعلیمات نے ابھی پورے طور پر گھر نہیں کیا تھا۔ اور ان کے دماغوں سے جاہلیت کے رسوم و عادات کے نقوش بالکل مٹے نہیں تھے اور ادھر محلاتِ شاہی میں ملک ملک کی لونڈیوں نے خلفاء اور شہزادوں کے اقلیم دل میں اپنی حکمرانی کا سکہ چلانا شروع کر دیا تھا۔ تدریجی طور پر یہ دونوں اثرات اپنا کام کرتے رہے۔ یہانتک کہ خلافت بنی عباس کے دوسرے دور میں خلافت محض برائے نام رہ گئی۔ خلفاء کے القاب اب بھی کروفر کی شان رکھتے تھے مگر جاننے والے جانتے تھے کہ ان ریشمی غلافوں کے اندر ایک جسم ناتواں چھپا ہوا ہے جو "ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ" ہونے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔ عربی کے ایک شاعر ابن ابی شرف نے بادشاہان اندلس کے پُرشکوہ القاب پر ایک مرتبہ طعن کرتے ہوئے کہا تھا۔

مما یزھدنی فی ارض اندلس	اسماءُ معتمدٍ فیھا و معتضدٍ
القابُ مملکۃٍ فی غیر موضعھا	کالھرِّ یحکی انتفاخًا صورۃَ الاسدِ

ترجمہ: جس چیز نے مجھکو اندلس سے برگشتہ کر دیا ہے وہ وہاں کے بادشاہوں کا معتمد اور معتضد جیسے نام رکھنا ہے یہ سلطنت کے القاب بالکل بے محل ہیں۔ ان کی مثال اس بلی کی سی ہے جو پھولکر شیر کی نقل اتارتی ہے۔"

یہ شعر بعینہ خلافتِ عباسیہ کی ان کٹ پتلیوں پر بھی صادق آتے ہیں جن کی ڈور محلِ شاہی کی کسی نازک اندام جاریہ کے دستِ سیمیں میں ہوتی تھی یا کسی غلامِ نافرجام کی انگشتِ آہن سرشت میں۔

وزارت کی ابتری جب خلافت بے دست و پا ہو چکی ہو تو پھر وزارت کا حال جو کچھ بھی ہو کم ہے اس کی ابتری اور پریشان حالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ منصبِ وزارت حاصل کرنے کے لئے پیش قرار

رشوتیں پیش کی جاتی تھیں اور اس طرح دربارِ خلافت سے اس شخص کو پروانۂ وزارت مل جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ رقم دے سکے۔ اگرچہ اس اہم عہدہ کی صلاحیت اس میں بالکل بھی نہ ہو۔ چنانچہ ابن الطقطقی کا بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں ابن مقلہ نے پانچ لاکھ دیناروں کی رشوت دیکر راضی باللہ سے وزارت کا عہدہ حاصل کیا[1]۔ اسی طرح ابنِ جہیر نے قائم بامراللہ کو تیس ہزار دنانیر کی گراں قدر رقم پیش کی تھی اور اس کے عوض منصبِ وزارت خریدا تھا۔[2]

رشوت ستانی کے سلسلہ میں ایک نہایت شرمناک اور حیرت انگیز واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ میں ناظرِ امور عامہ کی ایک جگہ خالی تھی، مقتدر باللہ کے وزیر خاقانی نے اس جگہ کے لئے ایک دن میں انیس آدمیوں سے رشوت لی اور ان میں سے ہر ایک کو اس منصب کا پروانہ لکھکر دیدیا۔ اب یہ لوگ روانہ ہوئے تو اتفاق سے راستہ میں ایک مقام پر سب کا اجتماع ہوگیا۔ یہاں ان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص وزیر کے پاس سب سے آخر میں گیا تھا اس کو ہی کوفہ پہنچکر یہ عہدہ سنبھالنا چاہئے۔ کیونکہ اس کے پروانہ کے لئے کوئی ناسخ نہیں ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا، سب سے آخر میں جس شخص کو کوفہ کی نظارت کا فرمان ملا تھا وہ کوفہ چلا گیا اور باقی سب وزیر کے پاس لوٹ آئے۔ اب وزیر نے ان لوگوں کو متفرق کام سپرد کردیئے۔"[3]

یہ روایت ابن الطقطقی کی ہے ممکن ہے من وعن صحیح نہ ہو۔ تاہم اس عہد کے عام حالات جو کم وبیش تمام تاریخوں میں مذکور ہیں ان کے پیش نظر یہ کوئی مستبعد اور ناممکن الوقوع بات نہیں ہے چنانچہ ایک شاعر نے اس وزیر کی ہجو میں کہا بھی ہے۔

وزیرٌ لا یملُّ من الرقاعہ	یُوَلّی ثُمَّ یعزل بعد ساعۃ
ویُدْنی من تعجل منہ مالٌ	ویبعد من توسّل بالشفاعۃ

[1] الفخری ص ۲۰۷۔ [2] الفخری ص ۲۱۴۔ [3] الفخری ص ۱۹۷۔

وإنّ أهلَ الرُّشا صاروا إليہ   فأحظى القوم أوفرهم بضاعةً

ترجمہ۔ یہ ایسا وزیر ہے جو رقعہ لکھنے سے اکتاتا نہیں ہے وہ ایک شخص کو والی بنا دیتا ہے پھر ایک گھنٹہ بعد اُسے معزول کر دیتا ہے جن لوگوں کی طرف سے اس کو جلدی رشوت موصول ہو جاتی ہے اسے اپنا مقرب کر لیتا ہے اور جو لوگ سفارش کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں انھیں اپنے سے دور کر دیتا ہے اور اگر اہلِ رشوت اس کے آس پاس آتے ہیں تو ان میں جو سب سے زیادہ مالدار ہوتا ہے وہی اس کے نزدیک سب سے زیادہ کامیاب رہتا ہے۔"

اب خود غور فرمائیے جس مملکت میں عہدے اور منصب بکتے ہوں، جہاں عیاشی اور رندی و بدمستی عام ہو، اور جہاں کے خلفاء اور امراء خود غرض، آرام طلب، عشرت کوش اور عاقبت نااندیش ہوں اس کو صحیح معنی میں خلافت کہنا تو درکنار کیا اسے ایک مسلم اسٹیٹ بھی کہا جا سکتا ہے؟

خلافت کے ٹکڑے | خلافت جو کل عالمِ اسلام کے لئے تھی اس کے حصے بخرے تو تیسری صدی ہجری کے آخر میں ہی ہونے لگے تھے۔ ایک طرف شمالی غربی افریقہ میں فاطمیوں نے اپنی امامت و خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور اب مصر کی طرف بھی ان لوگوں کی نگاہِ حرص و آز اٹھنے لگی تھی اور دوسری عبد الرحمٰن ناصر امیر اندلس نے جو ۳۰۰ھ میں تخت نشین ہوا اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح خلافت کے تین ٹکڑے ہو ہی چکے تھے کہ راضی باللہ (از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ) کے عہد میں جو ملک اور صوبے خلافتِ بغداد سے ملحق تھے ان میں بھی خود مختار سلطنتیں اور حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ چنانچہ فارس پر علی بن بویہ کا قبضہ تھا۔ رے، اصفہان اور جبل پر اس کے بھائی حسن بن بویہ نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ موصل دیار بکر و دیار ربیعۃ و مضیر پر بنو حمدان کی حکومت تھی۔ مصر اور شام، محمد بن طغج کے زیرنگین تھے پھر بنو فاطمہ کے پاس آ گئے۔ خراساں اور شرقی علاقے نصر بن احمد السامانی کے قبضہ میں تھے۔ اب خلافت سمٹ سمٹا کر بغداد اور اس کے اطراف میں محدود ہو کر رہ گئی اور سچ تو یہ ہے کہ بغداد میں بھی خلیفہ کا اقتدار برائے نام ہی تھا ورنہ یہاں کے سپید و سیاہ کا اصل مالک راضی باللہ کا ایک وزیر ابن رائق تھا

یہ واسط کا گورنر تھا۔ بعد میں اسے فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور امیر الامراء کے لقب سے بھی مشرف کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ نے بعد میں حکم دے دیا تھا کہ منبر پر خطبہ بھی ابن رائق کے ہی نام کا پڑھا جائے۔ [۵۱]

حنابلہ پر سخت تشدد

کیسی عجیب بات ہے کہ جو خلیفہ اس درجہ فیاض اور سیر چشم تھا کہ وہ خطبہ تک میں اپنی بجائے اپنے وزیر کا نام لینے کا حکم دیتا ہو۔ دینی معاملات میں حد درجہ تشدد پسند اور سخت گیر واقع ہوا تھا چنانچہ بغداد میں فسق و فجور کی کثرت و عام اشاعت دیکھکر امام احمد بن حنبل کے پیروکاروں نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ اس طرح ادا کرنا شروع کیا کہ جس کسی گھر میں نبیذ دیکھی اسے بہا دیا اور جہاں کہیں کوئی گانیوالی عورت ملی اسے زدوکوب کیا۔ اس سے اہل بغداد کی عشرت کوشی میں خلل پیدا ہونے لگا تو شہر کے کوتوال نے اعلانِ عام کرا دیا کہ بغداد میں کسی ایک جگہ پر بھی دو حنبلی جمع نہ ہوں۔ ساتھ ہی خلیفہ راضی باللہ نے حنابلہ کے لئے ایک تہدید آمیز تحریر لکھی جس میں اس نے لکھا تھا "اگر تم لوگ اپنے قبیح مذہب اور طریقِ کج سے باز نہیں آئے تو میں تم لوگوں کے ساتھ مار پیٹ۔ قتل و قتال اور تفریق و تشتیت ہر قسم کا برا معاملہ کرونگا۔ تلواریں تمہاری گردنوں پر ہونگی اور آگ تمہارے گھروں اور مکانوں میں۔" [۵۲]

خلافتِ بغداد کا دم واپسیں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے راضی باللہ کے عہد میں خلافت عملاً صرف بغداد اور اس کے نواحی و اطراف میں محدود ہو گئی تھی ۳۲۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اس کے بعد خلافتِ بغداد کے تخت پر سولہ خلفا اور متمکن ہوئے لیکن خلافت کو اب جو گھن لگ چکا تھا اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ درمیان میں کوئی کوئی خلیفہ ذاتی طور پر نیکدل اور حساس بھی ہوا لیکن نظامِ خلافت اس درجہ فاسد ہو چکا تھا کہ تنہا کسی ایک خلیفہ کی نیکی اس کی اصلاح کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[۵۱] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۱۱ ص ۱۲۳ - [۵۲] ایضاً ج ۱۱ ص ۱۲۲ و ۱۲۳ -

خلیفہ مختلف سلطنتوں اور حکومتوں کے درمیان ایسا مقید تھا جیسے ایک زبان دانتوں کے حلقہ میں محصور ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کے اختیارات اس درجہ محدود تھے کہ وہ خود اپنی مرضی سے کوئی ایک کام بھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔ آخر کار ۱۲۵۸ء میں اس نام نہاد خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ وزیر ابن علقمی کی سازش سے تاتاریوں کے ہاتھوں انتہائی بیدردی اور بےرحمی سے قتل کر دیا گیا۔

یہ تھا اس دور کا حال جس کو خود تاریخ بھی خلافتِ عباسیہ کا دورِ زوال کہتی ہے۔ اب آیئے ذرا اس دورِ اول کا جائزہ لیجئے جسے عام طور پر خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے؟ مگر یہ عہدِ زریں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لئے کس حد تک سرمایۂ فخر و مباہات ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مامون رشید جو اس دور کا گل سرسبد ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اس کے مسلک و مشرب کو اس شعر کا مصداق بتاتے ہیں ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ ؎ تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھکو

علوم و فنون کی ترقی اور زوال امت میں اس کا اثر

اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں نے اسلامی علوم و فنون کی تدوین کی اور دوسری زبانوں سے علوم فلسفہ و حکمت کے تراجم کیئے۔ صرف تراجم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان علوم کے مسائل پر روشن دماغی کے ساتھ غور و خوض کر کے ان کی تنقید کی۔ ان کے معائب و اسقام کو طشت ازبام کیا۔ اور مختلف علوم و فنون کی تدریس و اشاعت کے لئے مکاتب اور مدارس بلکہ یونیورسٹیاں قائم کیں۔ علماء کے گرانقدر وظائف اور مشاہرے مقرر تھے اور وہ اطمینان سے اپنے علمی کاموں میں شب و روز مصروف و مشغول رہتے تھے پھر علمی کاموں کے علاوہ صنعت و حرفت، فنِ تعمیر اور شعر و ادب کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ادب و تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات مذکور ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ

مرد تو مرد عورتیں بلکہ باندیاں تک اس زمانہ میں شعر و ادب کا بہت ستھرا اور شستہ مذاق رکھتی تھیں بات بات میں شعر کہتیں اور حاضر جوابی میں اپنا مثال نہیں رکھتی تھیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ علوم و فنون کی ترقی اور شعر و ادب کی گرم بازاری مسلمانوں میں بڑی حد تک ان میں دماغی بلند پروازی اور ذہنی ثقافت و عروج کے پیدا ہو جانے کا سبب ہوئی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اسلامی عقائد کی سادگی اور راسخ العقیدتی کو صدمۂ عظیم پہنچا اور یونانی علوم و فنون کی گرم بازاری نے خالص اسلامی افکار کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلمان عقیدہ و خیال کی وحدت سے کٹ کر ایک نہایت خطرناک قسم کی دماغی لامرکزیت میں مبتلا ہو گئے۔ مامون رشید نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کو لکھا کہ آپ کے پاس فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی جو کتابیں ہیں وہ ہمارے پاس بھجوا دیجئے۔ شاہِ روم کو پہلے پہل تو مامون کی اس فرمائش کی تکمیل میں تردد ہوا لیکن جب یہاں کے بڑے پادری نے کہا کہ آپ ان کتابوں کو ضرور بھجوا دیجئے کیوں کہ یہ کتابیں جہاں کہیں بھی ہوں گی ان سے دینی عقائد میں تذبذب پیدا ہو گا اور لادینی کو ترقی ہو گی" تو اس نے فوراً یہ تمام کتابیں دربارِ خلافت کے نذر کر دیں۔ پادری صاحب نے جو توقع ظاہر کی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔

چنانچہ ان کتابوں کا اثر یہی ہوا کہ شرعی اور الٰہیاتی مسائل کے متعلق مسلمانوں کا طریقِ فکر بدل گیا اور وہ ایک نئے انداز سے ہی اسلامی عقائد و افکار پر غور کرنے لگے۔ یہ نیا اندازِ فکر بے شبہ اس طریقِ فکر سے مغائر تھا جو قرآن مجید نے اپنے مخصوص اسلوبِ بیان اور طریقِ استدلال کے ذریعہ مسلمانوں میں پیدا کیا تھا اور جس کی وجہ سے ان میں مابعد الطبیعاتی حقائق کا اذعان اس درجہ پختہ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔

قرآنِ مجید کا اصولِ تفہیم | قرآن مجید کا ایک عام اصول یہ ہے کہ وہ پہلے کسی چیز کی نسبت ایک خاص قسم کا

فکر پیدا کرتا ہے پھر اس فکر کو شواہد و نظائر کے ذریعہ یقین کی صورت بخشتا ہے۔ اس کے بعد جب یہ یقین جذبہ کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے تو اب اس پر ان اعمالِ صالحہ کی شاندار عمارت قائم ہوتی ہے جن کے بغیر کوئی مدنیت مدنیت صالحہ نہیں بن سکتی۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اجمالاً ایمان باللہ کو لیجئے۔ قرآن انسان کے ضمیر و وجدان کو بیدار کر کے خدا کے وجود اور اس کی صفات کا یقین پیدا کرتا ہے اور فلسفیانہ دلائل کی موشگافیوں میں نہیں الجھاتا یعنی جس طرح ایک نابالغ بچہ اپنے ماں باپ کو پہچانتا اور ان کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے مگر اس کا یہ یقین اس احساسِ تعلق پر مبنی ہوتا ہے جو ماں باپ کی اس کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت اور اس کے ہر قسم کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے متجاوز ہو کر اس کو والدین کے زناشوئی تعلقات کا علم بالکل نہیں ہوتا اور غالباً اسی وجہ سے بچہ کو اپنے ماں باپ کے ساتھ جو شیفتگی اور گرویدگی اور ان کے اوامر و نواہی کو بجالانے کی جو آمادگی اس زمانہ میں ہوتی ہے وہ جوان ہو جانے کے بعد اس وقت باقی نہیں رہتی جبکہ اس کو والدین کے زناشوئی تعلق کا علم ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید انسانوں کو خدا کے وجود اور اس کی صفات کا جو یقین دلاتا ہے اس کے لئے وہ وہی طریق استدلال اختیار کرتا ہے جس سے ایک بچہ اپنے ماں باپ کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ یہی طریقہ فطری ہے اور اس راہ سے انسان جس چیز کا یقین پیدا کرے گا اس پر اعمالِ صالحہ کی بنیاد قائم ہو سکیگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں کہیں منکروں اور کافروں کی جہالت کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں کے دماغوں میں عقل نہیں ہے بلکہ ان کے قلوب کے سربمہر ہونے کا ماتم کیا ہے مثلاً "لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ[1] بِهَا" یا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"

[1] عربی زبان میں تفقہ کے معنی وجدان سے کسی بات کو معلوم کر لینے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے۔ (باقی صفحہ ۹۰)

بہر حال یہ ہے وہ طریقِ فکر جو قرآن نے مسلمانوں میں پیدا کیا اور جس سے ان میں عقیدہ و عمل کی استواری پیدا ہوئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عہدِ صحابہ و تابعین میں مسلمان خدا کی نسبت صرف اسقدر جانتے اور اس پر ایمانِ کامل رکھتے تھے کہ خدا خالقِ کائنات ہے۔ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی ذات تمام صفاتِ حسنہ کی مستجمع ہے۔

فلسفہ کا طریقِ استدلال

لیکن عہدِ بنی عباس میں جب یونانی فلسفہ کا زور ہوا تو اب مسلمانوں نے خدا کی نسبت بھی ایک دوسرے انداز سے سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ایک طرف خدا کو علتِ تامہ یا علتِ اولیٰ و مطلقہ کہا اور دوسری جانب چونکہ فلسفۂ یونان کا کلیہ "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" "ایک سے صرف ایک ہی صادر ہو سکتا ہے" ان کے نزدیک ناقابلِ تردید تھا۔ اس بنا پر انھیں عقولِ عشرہ ماننے پڑے۔ ان دونوں مسلمات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے خدا کی نسبت جو یقین دلایا ہے وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ خدا کے لئے مشیت ہے، ارادہ ہے اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اضطراراً نہیں بلکہ اختیار سے صادر ہوتے ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن فلسفۂ یونان کی اصطلاح کے مطابق اگر خدا کو عالم کے لئے علتِ تامہ کہا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا کے لئے نہ مشیت ہے اور نہ ارادہ ہے اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوا ہے اس میں خدا کے اختیار کو کوئی دخل نہیں بلکہ بالاضطرار ہوا ہے کیونکہ علتِ تامہ سے معلول کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا پھر چونکہ علتِ تامہ اور معلول کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم اور تاخر نہیں ہوتا اس لئے فلاسفہ کو ماننا پڑا ہے کہ خدا کی طرح عقلِ اول بھی قدیم بالذات ہے۔ اب خود غور فرمائیے کہ خدا کو عالم

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۸۹) عقل سے جو بات دریافت ہوتی ہے اس کیلئے ادراک یا تعقل وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں بجائے عقل و فہم کے جس کا موضع سر ہے کافروں کے دلوں کا ذکر کرنا اور ان کو خالی از تفقہ بتانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ قرآن مجید جو یقین انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ انسان کی عقل کے بجائے اس کے ضمیر و وجدان سے اپیل کرتا ہے۔

کی علتِ اولیٰ و مطلقہ قرار دیکر اگر اس کو مشیت ارادہ اور اختیار سے محروم مان لیا جائے تو پھر اسلام تو در کنار کسی ایک مذہب کی عمارت بھی قائم رہ سکتی ہے؟

وجود کی طرح خدا کی صفات کی نسبت بھی موشگافیاں کی گئیں اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب طرح کی بحثیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پہلی بحث تو یہ تھی کہ صفات کا ذاتِ خداوندی کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ یعنی وہ عین ذات ہیں یا غیر ذات یا نہ عین ہیں اور نہ غیر۔ پھر دوسری بحث یہ تھی کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی اگر علم بغیر معلوم کے نہیں ہو سکتا تو جب خدا کے سوا کوئی شے بھی موجود نہ تھی اس وقت خدا کیونکر علیم ہوگا؟ پھر خدا کی ذات و صفات سے قطع نظر دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کی گئی۔ مثلاً یہ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یا نہیں؟ انسان مجبورِ محض ہے یا مختارِ مطلق یا نیم مجبور و نیم مختار۔ عقلی اعتبار سے تین احتمالات نکلتے تھے وہی تینوں احتمالات مستقلاً تین فرقوں کی بنیاد قرار پاگئے اور اس کا اثر عقیدۂ ثواب و عقاب پر ہوا۔ اسی سلسلہ میں قرآن کے متعلق بحثیں ہوئیں کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اور اگر مخلوق ہے تو پھر وہ اللہ کا کلام کیونکر ہوا؟ اور اگر غیر مخلوق ہے تو اس میں شانِ حدوث کیوں پائی جاتی ہے؟ وحی کیونکر نازل ہوتی ہے؟ خدا کے بولنے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا دیدار ممکن ہے یا ناممکن؟ دوزخ کا عذاب ابدی ہے یا غیر ابدی۔ غرض یہ ہے کہ اس عہد میں شریعتِ اسلام کا کوئی نظری یا عملی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو فلسفہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ طبعی طور پر اس کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا مسلمانوں میں دماغی پراگندگی اور ذہنی انتشار پیدا ہوگیا، افکار و آراء کے مختلف اسکول قائم ہوگئے [1] اور عہدِ بنی امیہ میں چند در چند علمی کمزوریوں کے باوجود مسلمان اب تک جس

---

[1] اگر آپ کو اس بحرانِ دماغی کی روئداد معلوم کرنی ہو تو علامہ عبدالکریم شہرستانی اور ابن حزم ظاہری کی کتاب الفصل فی الملل والنحل اور "الفرق بین الفرق" مصنفہ ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بن محمد البغدادی المتوفی ۴۲۹ھ پڑھئے۔

مصیبتِ عظمیٰ سے محفوظ تھے یعنی عقیدہ وخیال کی کمزوری اور ابتری اب وہ اس کا بھی شکار ہو گئے فلسفۂ یونان میں انہماک کے انھیں ہولناک نتائج کو دیکھکر علامہ جلال الدین سیوطی نے تو ایک مستقل کتاب ہی یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی تھی کہ علوم فلسفہ اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے علامہ نے اس کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ تمام سلف کا اسی پر اجماع ہے [1]

علمِ کلام فلسفہ اور مذہب کے امتزاج سے علمِ کلام کی بنیاد پڑی، جس کے معنیٰ یہ تھے کہ کسی شرعی حقیقت پر ایمان لانے کے لئے صرف قرآن اور حدیث کا بیان کافی نہیں ہے بلکہ وہ اس وقت تک درخور پذیرائی نہیں ہوگی جب تک کہ فلسفہ کی بارگاہ سے اس کی صحت کا فتویٰ صادر نہیں ہو جائیگا اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے علم کے ذریعۂ اعلیٰ وحی والہام کو چھوڑ کر اس کے ذریعۂ ادنیٰ یعنی فلسفہ واستدلالِ منطقی کو اپنا ملجاؔ وماویٰ بنا لیا۔ ایک یقین کی شاہراہ کو ترک کر کے ظن وگمان کے راستہ پر پڑ لینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی بنا پر شروع شروع میں علماءِ اسلام نے علمِ کلام کی شدید مخالفت کی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو ممنوع قرار دیا۔

چنانچہ امام شافعیؒ تو یہانتک فرماتے تھے "اہلِ کلام کے بارہ میں میرا حکم یہ ہے کہ ان لوگوں کو کوڑوں اور جوتوں سے پٹوایا جائے۔ اور قبیلوں اور محلوں میں ان کو ذلت کے ساتھ پھرایا جائے اور یہ اعلان ہوتا رہے کہ یہ سزا ہے اس شخص کی جس نے کتاب اور سنت کو چھوڑ کر اہلِ بدعت کے کلام پر توجہ کی"[2] مگر جب انھوں نے دیکھا کہ دربارِ خلافت کی سرپرستی کے باعث یہ سیلاب رکتا نہیں، بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اسلامی عقائد وافکار کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی ہیں تو اب اُنھیں مجبوراً ادھر کا رخ کرنا پڑا۔ اس دور میں جن لوگوں نے دینی حقائق کی صحت کو معلوم کرنے کا ذریعہ فقط عقل کو بنایا ان کی مثال اس احمق کی سی ہے جو کسی گز سے سمندر کے پانی کو ناپنے کی کوشش

---

[1] و [2] شرح الفقہ الاکبر ص ۳۔

کرتا ہے اور آخر کار سمندر کی وسعتوں اور پانی کی لہروں میں اپنے دیدۂ امتیاز کی صلاحیتوں کو
گم کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے عارف رومی نے فرمایا ہے "پائے استدلالیاں چوبیں بود"
یعنی دین قیم کی منزل وہ نہیں ہے جو اس مصنوعی پاؤں سے سر ہو سکے[1]۔ اردو میں حضرت اکبر الٰہ آبادی
نے اسی حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ۔۔۔ ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک طرف امام غزالیؒ۔ ابن رشد اور امام رازی ایسے اجلّہ علماء اپنے
مضبوط دلائل و براہین کے ذریعہ اور دوسری جانب متوکل باللہ عباسی اور سلطان سنجر جیسے بادشاہ
جو فلسفہ کی اشاعت کو دینِ حق کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے۔ اپنی طاقت و قوت سے فلسفہ
کے ان فاسد اثرات کا تدارک نہ کرتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ عہد بنی عباس کے دورِ زریں کا یہ شجرِ زہراثر
کیسے کیسے برگ و بار پیدا کرتا اور ان کے باعث اسلامی عقائد کو کتنا صدمۂ عظیم پہنچتا۔
خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو گمراہیاں پیدا ہوئیں ان کا سرچشمہ دو ہی چیزیں ہیں ایک
حکومت و سلطنت کا فاسد نظام، جس کی داغ بیل بنو امیہ کے ہاتھوں پڑی، دوسری چیز

---

[1] حضرت علیؓ فرماتے تھے "اگر دین کا دارومدار قیاس (عقل) پر ہوتا تو باطنِ خف (چرمی موزہ) پر مسح کرنا ظاہرِ
خف پر مسح کرنے سے اولیٰ ہوتا" مولانا رومیؒ کا مشہور شعر ہے ؎

گر باستدلال کارِ دیں بدے ۔۔۔ فخر رازی رازدارِ دیں بدے

مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کو ایک مرتبہ سرسید احمد خاں نے لکھا "حضرت! دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں
ہونی چاہئے" مولانا نے جواب میں لکھا "آپ نے الٹا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ عقل کی کوئی بات دین کے خلاف نہیں ہونی
چاہئے" خلافت عباسیہ میں جو گمراہیاں پھیلیں ان کا سرچشمہ یہی تھا کہ اس دور میں علوم عقلیہ کی گرم بازاری کے
باعث دین کو عقل کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔ گویا یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا کہ عقل تو سراسر بے قصور اور
بے خطا ہے۔ بنو امیہ کے دورِ آخر میں اس تحریکِ عقلیت کا آغاز ہو گیا تھا مگر اس کا عروج خلافت عباسیہ میں ہوا
جبکہ فلسفہ کی شکل میں اس کا ایک بظاہر قوی مددگار پیدا ہو گیا۔

علوم وفنون عقلیہ کی گرم بازاری ہے جس کی سرپرستی کا شرف بنو عباس کو حاصل ہے اور جس کو اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ کہا جاتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام علم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا یا علوم وفنون کی ترقی اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل چیز اسلامی وجدان ہے۔ اسلامی وجدان اگر زندہ ہے تو پھر خواہ کوئی علم حاصل کیا جائے (بشرطیکہ وہ وہم وسفسطہ میں مبتلا نہ کر دیتا ہو) کسی مسلمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا یہی وجہ ہے کہ جس فلسفہ نے الحاد وزندقہ عام کر دیا۔ اسی فلسفہ کی درسگاہ سے امام غزالیؒ امام رازی۔ ابن رشد اور حافظ ابن تیمیہؒ وغیرہ ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، ان حضرات نے فلسفہ سے دین کی خدمت کا کام لیا، یہ نہیں کیا کہ دین کے لئے فلسفہ کو معیار بنا دیا ہو۔"

ہارون اور مامون رشید کے زمانہ میں یونانی علوم وفنون کے جو تراجم ہوئے ان میں زیادہ تر دخل یا تو غیر مسلموں کا تھا اور جن مسلمانوں کا دخل تھا ان میں اکثریت ایران سے تعلق رکھنے والوں کی تھی جن کے دلوں میں اسلامی عقائد اچھی طرح جانشین نہ ہوئے تھے اس بنا پر درحقیقت تباہی کا راز ہی یہ ہے کہ جو چیز دینی معلومات کیلئے اصل تھی یعنی قرآن وحدیث اس کو ثانوی حیثیت دیدی گئی اور جس چیز کو بعد میں رکھنا تھا اسے پہلے درجہ میں رکھا گیا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ عقلی علوم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اشیاءِ عالم کے خواص۔ ان کے نفع وضرر اور ان کے طُرقِ استعمال وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے علوم کے ساتھ اسلام کا کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ دوسرے علوم وہ ہیں جو حقائق مابعد الطبیعی سے بحث کرتے ہیں۔ ان علوم کی نسبت بے شبہ اسلام کا رجحان یہ ہے کہ آپ ان کو حاصل تو کر سکتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ انھیں حاصل کرنا چاہئے لیکن ساتھ ہی یہ

ضروری ہے کہ آپ عقل کو اس کے اپنے دائرۂ عمل تک محدود رکھیں اور الٰہی تعلیمات کی نسبت آپ کا یقین ایسا قوی ہونا چاہیئے کہ اگر ان دونوں میں تعارض نظر آئے تو آپ کو وحی و الہام پر شک و شبہ کرنے کے بجائے اپنی یا فلاسفہ کی عقل کا تخطیہ کرنے میں باک نہ ہو۔ غرض یہ ہے کہ اولاً ایک مسلمان بچہ کی تربیت اور تعلیم خالص اسلامی ہونی چاہیئے اور جب اسلام کی تعلیمات اس کے دل اور دماغ پر چھا جائیں اور اس کا ذوقِ دینی پختہ تر ہو جائے تو اب وہ جو علم چاہے حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم علومِ مفیدہ کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہو۔"

اسلام پر صلیبی حملے

اسلام کا عروج یورپ کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے اور اس بنا پر اسے جب کبھی موقع ملا ہے اس نے مسلمانوں کی سیاسی طاقت و قوت کا شیرازہ پراگندہ کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا خلافت بنی عباس کے دورِ اول میں رومیوں نے بار بار حملے کئے مگر ہر دفعہ انھیں بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا گیا۔

پانچویں صدی کے آخر میں خلافت عباسیہ کی حد درجہ کمزوری اور انحطاط اور پھر مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں عالم اسلام کے تقسیم ہو جانے سے یورپ کو حوصلہ ہوا کہ اب پھر ایک نئی تنظیم کے ساتھ مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی جدوجہد شروع کرے چنانچہ ۴۷۸ھ میں اندلس کے علاقوں میں سے طلیطلہ اور دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ۴۸۴ھ میں جزیرۂ صقلیہ کا رخ کیا اور مسلمانوں کو اس سے بھی بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے افریقہ کا ارادہ کیا اور اس کے بعض علاقوں پر بھی قابض ہو گئے۔ ۴۹۱ھ میں ان کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ خاص ملکِ شام پر جو مسلمانوں

کی طاقت و قوت کا مرکز تھا انھوں نے حملہ کر دیا[۵۱]۔ اور انطاکیہ پر قبضہ بھی کر لیا مسلمان بڑے تزک و احتشام سے قوام الدولہ کربوقا کی زیرِ قیادت اہلِ فرنگ کے مقابلہ کے لئے مرج دابق میں جمع ہوئے۔ اس لشکر میں ترک اور عرب دونوں فوجیں شامل تھیں۔ مسلمانوں نے انطاکیہ پہنچکر حملہ کیا۔ شروع میں فرنگیوں کی حالت بہت نازک تھی۔ سامانِ حرب اور فوجیوں کی کمی کے علاوہ سامان رسد پہنچنے کے ذرائع بھی مسدود تھے۔ لیکن سوءِ تدبیر سے یکایک حالت ایسی منقلب ہوئی کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ ہزاروں علماء اور مجاہدین سپرد تیغ ہو گئے اور بے شمار سامان دشمنوں کے ہاتھ آیا۔

اب عیسائیوں نے معرۃ النعمان کا رخ کیا۔ یہاں کے باشندوں نے بڑی ہمت اور دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن یہاں بھی فرنگیوں کی ایک چال کارگر ہوگئی اور وہ شہر میں داخل ہو کر تین دن تک مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ مورخ ابن اثیر الجزری کا بیان ہے کہ اس قتلِ عام میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے اور جو مرد اور عورتیں گرفتار ہوئیں ان کا تو شمار بھی مشکل ہے۔[۵۲]

ان کامیابیوں کے نشہ میں سرشار ہو کر اب صلیبیوں نے چاہا کہ بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا جائے چنانچہ ۱۰۹۲ء میں انھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تقریباً چالیس روز تک جاری رہا۔ آخر کار ۲۲ شعبان المعظم کو اہلِ یورپ بیت المقدس میں داخل ہو گئے اور اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی قتل و قتال کا بازار اس درجہ گرم کیا کہ جو علماء مشائخ طریقت اور عُبّاد و زُہّاد جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر اس بلدۂ مقدسہ میں گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ اس قتل عام میں خاص مسجدِ اقصیٰ میں کام آئے

---

[۵۱] ملک شام پر فرنگیوں کے اس حملہ کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مصر میں علویوں کی حکومت تھی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ سلجوقیوں کی قوت و شوکت روز بروز بڑھ رہی ہے اور وہ غزہ تک شام میں آگھسے ہیں۔ تو اب ان کو مصر کا خطرہ پیدا ہوا اور انھوں نے ہی اس خطرہ سے بچنے کے لئے اہلِ فرنگ کو شام پر قبضہ کر لینے کی دعوت دی۔ (ابن اثیر الجزری ج ۱۰ ص ۹۴) [۵۲] ج ۱۰ ص ۹۶۔

صرف ان کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔[۹۱] اس کے علاوہ نہایت بیش قیمت سونے اور چاندی کی قندیلیں جو مسجد میں جا بجا آویزاں تھیں وہ سب لوٹ لیں۔ اِن کے سوا جو مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا اس کا کوئی شمار ہی نہیں۔ اب اہلِ یورپ نے انطاکیہ، رُہا اور بیت المقدس اپنی تین ریاستیں قائم کر دیں۔

اسی سال اہلِ فرنگ نے مصر کا رخ کیا۔ امیر جیوش افضل نے ان لوگوں کے مقابلہ کی تیاریاں بڑے پیمانہ پر کی تھیں، لیکن فرنگیوں نے اہلِ مصر پر اچانک حملہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا اور ان کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد مسلمانوں و عیسائیوں میں اور بھی چھوٹے بڑے کئی معرکے ہوئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لائق ذکر وہ یورش ہے جو اہلِ یورپ نے ۵۴۲ھ میں کی تھی۔ اس یورش کا سبب یہ تھا کہ سلطان نورالدین زنگی نے صلیبیوں کی شوریدہ سری دیکھ کر ان پر پے بہ پے کامیاب حملے کئے اور رُہا کو جو ان کا بڑا مستقر تھا فتح کر لیا۔ اس شکست سے صلیبیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور انھوں نے پاپائے روم سے درخواست کی کہ وہ اہلِ یورپ کو امداد کے لئے آمادہ کرے۔ پاپائے روم نے تمام یورپین ممالک میں اعلان کر دیا کہ تمام عیسائیوں کو مقدس کلیسا اور مسیحیت کی حفاظت و بقا کے لئے ایک محاذ پر جمع ہو جانا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی فرانس، جرمنی، آسٹریا اور انگلستان سے آ آ کر صلیبی فوج جوق در جوق جمع ہو کر روانہ ہوئی۔ شاہ فرانس لوئس سابع اور شاہِ جرمنی کونراڈ بھی ساتھ تھے۔ غرض یہ ہے کہ یہ وقت تھا جبکہ اسپین اور پرتگال کو چھوڑ کر تمام یورپ پاپائے روم کی آواز پر جمع ہو گیا تھا اور مقدس کلیسا کے نام پر اسلام کو تہ و بالا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت و قوت کے ساتھ امنڈ پڑا تھا۔

صلیبی حملوں کا دندان شکن جواب — اس وقت خلافتِ عباسیہ بے دست و پا تھی اور مختلف صوبوں اور

---

[۹۱] ابن اثیر الجزری ج ۱۰ ص ۹۸۔

ملکوں میں جو حکومتیں قائم تھیں وہ خود آپس میں دست و گریباں تھیں لیکن چونکہ اسلام دین برحق ہے اور اُسے قیامت تک کے لئے اس دنیا میں رہنا ہے اس لئے خدا نے بنو عباس کو دین قیم کی حمایت و نصرت کی توفیق سے محروم کرکے پہلے سلجوقیوں کو اتنی طاقت و قوت عطا فرمائی کہ وہ صلیبیوں کی شورشوں اور ان کے فتنوں کا سدباب کرسکیں۔ چنانچہ ۴۸۹ھ میں یورپ سے جو پہلی صلیبی فوج روانہ ہوئی تھی اور ہنگری اور بلغاریہ کے باشندوں سے لڑتی لڑاتی اور لوٹ مار مچاتی ہوئی ایشیائے کوچک پہنچی تھی تو یہاں سلطان قلیج ارسلان سلجوقی نے ہی اس فوج کا اس بہادری اور دلیری سے مقابلہ کیا کہ اُسے بالکل ختم کرکے رکھدیا۔

سلطان نورالدین زنگی | پھر جب سلجوقیوں میں آپس میں پھوٹ پڑگئی اور اندرونی اختلافات کے باعث ان کی حکومت میں اضمحلال پیدا ہوگیا تو اب خدا نے صلیبیوں کا زور توڑنے کے لئے سلطان نورالدین زنگی اور اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کے دست و بازو میں وہ طاقت و قوت دی کہ انھوں نے اہلِ یورپ کے دم خم ڈھیلے اور ان کے حوصلے پست کردیئے۔ چنانچہ اٹلی، فرانس، جرمنی اور آسٹریا اور انگلستان ان سب نے متفق و متحد ہو ہو کر کئی مرتبہ ایشیائے کوچک اور شام پر حملہ کیا۔ لیکن نورالدین زنگی کی شمشیرِ خارا شگاف نے ہر بار ان کو شکستِ فاش دیکر بھگا دیا۔ سلطان نے صرف مدافعت نہیں کی بلکہ صلیبیوں کے خلاف پے بہ پے حملے کرکے ان سے رُہا کو چھین لیا جو صلیبیوں کا ایک بڑا مستقر تھا۔ سلطان نورالدین زنگی کے جنگی کارناموں اور فتوحات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی | سلطان نورالدین زنگی نے ۵۶۹ھ میں وفات پائی۔ تو اب سلطان صلاح الدین ایوبی کو استقلال نصیب ہوا۔ اور مصر کے علاوہ شام، حلب، رہا، سنجار اور موصل پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا مصر اور شام کے اندرونی خلفشار کو دور کرنے اور یہاں کے حالات سے مطمئن ہو جانے کے بعد

غازی مرحوم نے اپنی پوری توجہ صلیبیوں کی بیخ کنی پر مبذول کردی۔ چنانچہ ۵۷۴ھ میں سلطان صلاح الدین نے اہل یورپ کے ساتھ جہاد شروع کیا اور متواتر چودہ سال تک لڑ کر ایک ایک شہر ان کے قبضہ سے نکال لیا۔ یہاں تک کہ ۵۸۳ھ میں حطین۔ عکا۔ طبریہ اور عسقلان اور اس کے مضافات کو فتح کر لینے کے بعد سلطان خلد آشیاں نے بیت المقدس کو بھی صلیبیوں کے ہاتھوں سے چھین لیا اور یہ بلدۂ مقدسہ پھر فرزندان توحید کے قبضہ میں آگیا۔ بیت المقدس کا ہاتھ سے نکل جانا کوئی ایسا زخم نہ تھا جس کو صلیبی آسانی سے فراموش کر دیتے۔ چنانچہ پاپائے روم اربانس ثالث نے اب پھر شور مچایا اور ایک اور صلیبی جنگ کے لئے سب عیسائیوں کو آمادہ کردیا۔ اس معرکہ میں فرانس کا بادشاہ فلپ آگسٹس اور شاہ انگلینڈ رچرڈ شیردل۔ دونوں اپنی اپنی جرار فوجیں لئے ہوئے بڑھے۔ اسٹریا کا بادشاہ فریڈرک بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس مرتبہ پھر شریک تھا۔ بحری راستہ سے یہ سب لوگ فلسطین پہنچے لیکن صلاح الدین کے مقابلہ میں کیا جم سکتے تھے۔ بالآخر شعبان ۵۸۸ھ میں صلیبیوں نے مجبور ہو کر صلح کی پیش کش کی، سلطان صلاح الدین نے اپنے مشیران خاص سے مشورہ کرنے کے بعد اس کو منظور فرمالیا۔ اس سلسلہ میں ایک حلف نامہ لکھا گیا جس کی رو سے یہ لڑائی ساڑھے تین برس کے لئے ختم ہوگئی اور سلطان فتح و ظفر کا پھریرہ اڑاتا ہوا دمشق آگیا۔ یہیں ۵۸۹ھ میں ۵۷ سال کی عمر میں اس عالم فانی کو الوداع کہا۔[۵۱]

[۵۱] اس موقع پر یہ جاننا بھی فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی یہ دونوں جس طرح بہت بڑے مجاہد تھے کہ انھوں نے صلیبیوں کا زور توڑ کر اسلام کا کلمہ اونچا کردیا۔ اسی طرح وہ بیحد متقی۔ متواضع۔ رقیق القلب۔ عدل گستر۔ نیکدل اور با مروت و حلیم بھی تھے۔ کتابیں ان کے مناقب و فضائل سے پر ہیں۔ صلاح الدین کے سلطان ہونے سے پہلے مصر میں دولتِ فاطمیہ قائم تھی۔ یہ لوگ چونکہ غالی شیعہ تھے اس لئے انھوں نے مصر میں رفض و شیعیت کو بہت کچھ فروغ دیا تھا۔ جامع ازہر میں باقاعدہ اسماعیلیت کا درس ہوتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ موذن اذان میں "حی علی خیر العمل" پکارنے پر مجبور تھے۔ سلطان صلاح الدین نے صاحب افسر و اورنگ ہوتے ہی ان تمام مفاسد کی اصلاح کی۔ اسماعیلیت کے شعائر و آثار کو مٹایا۔ اور رعایا پر جو ناجائز ٹیکس لگے ہوئے تھے انھیں بیک قلم موقوف کردیا (باقی صفحہ پر)

مرض الموت سے چند روز پہلے سلطان صلاح الدین نے اپنے بیٹے افضل اور بھائی ملک عادل کو بلاکر کہا "اب ہم فرنگیوں کی طرف سے تو بالکل مطمئن ہوگئے ہیں۔ ان شہروں میں اب ہم کو ان کا کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔ اس طرف سے فارغ ہونے کے بعد غازی صلاح الدین کا ارادہ تھا کہ روم کی طرف متوجہ ہوں تاکہ عیسائی خشکی کے راستہ سے بھی مسلمانوں کی طرف نہ بڑھ سکیں لیکن افسوس ہے کہ موت نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

سلطان کی وفات پر حکومت کی تقسیم اور صلیبیوں کے حملے

سلطان نے امراء کے مشورہ سے اپنی زندگی میں ہی سلطنت کو اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کردیا تھا مصر کی حکومت عمادالدین عثمان کو ملی۔ دمشق نورالدین کو جس کا لقب ملک افضل تھا ملا۔ اور غیاث الدین ابوالفتح غازی کو ملک ظاہر کا لقب دیکر عراق عجم کا بادشاہ بنادیا ان کے علاوہ جو اور بیٹے تھے ان کو چھوٹے چھوٹے اقطاع دیکر مطمئن کردیا۔

مصر کا بادشاہ عمادالدین عثمان جس کا لقب ملک عزیز تھا بعض ذاتی خوبیوں کے باوصف امورِ سلطنت کی انجام دہی میں سست تھا۔ ۵۹۵ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اب ملک عزیز کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا جس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ یہ دیکھکر صلاح الدین کے بھائی ملک عادل ایک فوج لئے ہوئے آیا اور خود حکومت پر قابض ہوگیا۔

ادھر یورپ میں جب خبر پہنچی کہ سلطان صلاح الدین کا انتقال ہوچکا اور حکومت کے تین ٹکڑے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹) مذاہب اربعہ کی تعلیم وتدریس کا انتظام کیا۔ علماء اور مشائخ کے وظیفے مقرر کئے۔ مدارس اور شفاخانے بنوائے ملک کی زراعت کو ترقی دی اور ہر طرح رعایا کو خوش وخرم اور مرفہ الحال رکھنے کی کوشش کی۔ سلطان نورالدین زنگی کا حال بھی یہی تھا۔ شب وروز اسلام کی فلاح وبہبود اور اس کی ترقی وعروج کی مساعی میں مصروف رہتا تھا۔ تقوی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نام جو تھوڑی بہت جائداد تھی اس کی آمدنی سے گذر کرتا تھا۔ بیت المال کا ایک پیسہ اپنے ذاتی صرف میں نہیں لاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ قدرت نے اس عام طوائف الملوکی کے زمانہ میں کس طرح نورالدین اور صلاح الدین سے اسلام کی حمایت واعانت اور اس کی بقاو نصرت کا کام لیا۔

ہو گئے ہیں تو اب پھر پاپائے روم کی دعوت پر یورپ میں صلیبی جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس جنگ میں فرانس اور انگلستان کے بادشاہ تو شریک نہ ہو سکے البتہ فریڈرک کا بیٹا ہنری جو شاہِ اسٹریا تھا ایک فوج لیکر روانہ ہوا لیکن یہ لشکر جزیرۂ صقلیہ (سسلی) سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۵۹۹ھ میں پاپائے روم انوشان سوئم کی دعوت پر یورپ نے پھر جنگِ صلیبی کا ارادہ کیا لیکن ابھی یہ فوج راستہ میں ہی تھی کہ رومی شہنشاہیت کے کسی شخص نے جو قیصر سے کسی بات پر ناراض ہو گیا تھا صلیبی فوج کے قائدین سے کہا کہ قسطنطنیہ بیت المقدس کی کنجی ہے اگر اس کو فتح کر لیا جائے تو بیت المقدس بہت آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ قائدینِ فوج کو یہ بات پسند آئی اور زبردستی قسطنطنیہ میں داخل ہو کر انھوں نے اس کی مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ غرض یہ ہے کہ یہ لوگ رومیوں سے ہی الجھے رہے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ کلیسا کو اس کا علم ہوا تو انھیں بہت لعنت ملامت کی۔[1]

قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینے کے بعد اب عیسائیوں کے لئے شام جانا نسبتہً سہل ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے ۶۰۰ھ میں بیت المقدس کو فتح کر لینے کے ارادہ سے ایک فوجِ عظیم کے ساتھ کوچ کیا اور عکا میں آکر ڈیرے ڈالدیئے اور اطراف و اکناف کی اسلامی آبادیوں پر لوٹ مار مچانا شروع کر دیا۔ سلطان صلاح الدین کا بھائی ملک عادل دمشق میں تھا وہ شام اور مصر کی فوجیں جمع کر کے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے بڑھا اور عکا کے قریب ایک مقام پر لشکر انداز ہوا۔ امراء نے ہرچند کہا کہ آپ عیسائیوں کے ملک پر حملہ کیجئے لیکن ملک عادل اس وقت اس تجویز کو مصلحت کے خلاف سمجھکر خاموش رہا۔ یہانتک کہ ۶۰۱ھ میں ملک عادل اور اہلِ فرنگ دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔

۶۱۳ھ میں صلیبیوں نے پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ چونکہ ان کی کثرت تھی اور سازوسامان بھی بہت زیادہ تھا اس لئے انھوں نے شام کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا اور یہاں سے فارغ ہو کر ۶۱۵ھ میں مصر کی

---

[1] ابن اثیر ج ۱۲ ص ۷۳ و ۷۴ پر اس واقعہ کو مفصل لکھا ہے۔

طرف بڑھے اور دمیاط پر قابض ہوگئے۔ اسی اثنار میں ملک عادل کی وفات ہوگئی اور اس کا بیٹا ملک کامل سریرآرائے سلطنت ہوا اس نے صلیبیوں کو دمیاط سے نکال باہر کیا۔

۶۳۵ھ میں ملک کامل کی وفات پر ملک سیف الدین ابوبکر جس کا لقب ملک عادل اصغر تھا، تخت نشین ہوا، لیکن لہو ولعب میں وقت گذاری اور اپنے بھائی ملک صالح نجم الدین سے سخت نا اتفاقی کے باعث ۶۳۷ھ میں قتل کر دیا گیا۔

اب ملک عادل اصغر کا بھائی ملک صالح تخت نشین ہوا۔ اسی کے عہد میں فرانس کے بادشاہ لوئس نہم نے دمیاط پر حملہ کیا ملک صالح بیمار تھا مگر اسی حالت میں مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار اسی اثنار میں انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی شجرۃ الدر نہایت عاقلہ تھی اس نے بادشاہ کی موت کو مخفی رکھا اور تمام فرامین پر خود اُس کی طرف سے دستخط کرتی رہیں۔ شجرۃ الدر کا بیٹا توران شاہ بلاد کرد میں تھا۔ اب اس نے صلیب پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بیٹے کو اپنے پاس بلالیا۔ توران شاہ نے یہاں آکر اس بہادری اور دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ لوئس نہم کو گرفتار کر لیا مگر بعد میں خود توران شاہ مارا گیا اور اب عنانِ حکومت شجرۃ الدر نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور فدیہ کی رقم خطیر کے بدلہ میں لوئس کو آزاد کر دیا۔؎

صفحات بالا میں صلیبی لڑائیوں کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ وقت جبکہ تمام یورپ اسلام کی طاقت و سطوت کو ختم کرنے کے لئے امنڈ آیا تھا مسلمانوں کے لئے کس درجہ نازک اور خطرناک تھا۔ اس وقت اسلام کی مدافعت کا فرض سب سے پہلے خلفار بنو عباس پر عائد ہوتا تھا لیکن اب ان کی حیثیت صرف اتنی ہی رہ گئی تھی کہ دور بیٹھے ہوئے ان واقعات کا نظارہ کرتے رہیں۔ خود عملی شرکت کرنے کے لائق نہ تھے۔ بغداد سے قطع نظر مصر میں جو دولتِ فاطمیہ قائم تھی اس کی حالت خلافتِ بغداد سے بھی گئی گذری تھی۔ فائز بنصر اللہ المتوفی ۵۵۶ھ کے عہد میں تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ ہر سال صلیبیوں کو ایک بڑی رقم اس لئے بھیجنی پڑتی تھی کہ وہ مصر پر حملہ آور نہ ہوں۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ ان حالات میں سلطان نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی اوران کے بھائی اور بھتیجہ ملک عادل وکامل نے جس بہادری، جوش وخروش ثبات واستقلال اور خلوص وللہیت کے ساتھ صلیبیوں کامقابلہ کرکے اسلام کی حمایت ونصرت کافرض انجام دیاہے وہ تاریخِ اسلام کا ایسا روشن باب ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

سلاجقہ | ان سلاطین کی طرح سلاجقہ نے بھی رومیوں کا زور توڑکر اور خاص قونیہ کو اپنی حکومت کا مستقر بناکر اسلام کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس موقع پر اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں سلطان الپ ارسلان کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز ہے۔سلطان الپ ارسلان نے رومیوں کے ساتھ کئی معرکے کئے اور ان میں کامیابی حاصل کی۔ آخرکار ۴۶۳ھ میں روم کے بادشاہ ارمانوس نے بڑی شاندار تیاریاں کیں اور دو لاکھ سپاہ کے ساتھ مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے کی نیت سے بڑھا۔جب بلاد کرد پہنچا تو سلطان الپ ارسلان کو اس کی اطلاع ہوئی۔ الپ ارسلان اس وقت آذربیجان کے کسی علاقہ میں مقیم تھا۔جہاں اس کے پاس صرف پندرہ ہزار سواروں کا ایک لشکر تھا۔ادھر دشمن قریب تھا اور حلب وغیرہ سے کوئی کمک پہنچ نہیں سکتی تھی،چاروناچار خدا کا نام لیکر شاہِ روم سے مقابلہ کے لئے بڑھا۔ کہاں دولاکھ کا ایک لشکر جرار اور کہاں پندرہ ہزار سواروں کی ایک قلیل فوج۔ جنگ شروع ہونے سی قبل سلطان الپ ارسلان نے شاہ روم کے پاس صلح کا پیغام بھیجا لیکن شاہِ روم کو اپنی کثرتِ سپاہ پر ناز تھا اس نے کہلا بھیجا" صلح تو اب" رے" میں ہوگی"۔سلطان یہ جواب سنکر برافروختہ ہوگیا اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔عسکرشاہی کے امام اور فقیہ ابونصر محمد بن عبدالملک البخاری الحنفی نے سلطان سے کہا" آپ اس دین (اسلام) کی حمایت واعانت کے لئے لڑنے جارہے ہیں جس کی فتح وکامرانی کا ذمہ اللہ نے لیا ہی اس بنا پر مجھکو قوی امید ہے کہ خدا نے آپ کے نام پہر فتح لکھدی ہے۔اب آپ یہ کیجئے کہ جمعہ کی نماز کے بعد دشمن کے مقابلہ میں روانہ ہوجائیے تاکہ نمازی نماز کے بعد مجاہدین اسلام کے لئے دعائیں مانگیں

امام صاحب کے مشورہ کے مطابق سلطان الپ ارسلان نے یہی کیا اگلے دن جمعہ تھا، پہلے سب مسلمانوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی۔ پھر بارگاہِ ایزدی میں اس عاجزی اور الحاح وزاری سے فتح وظفر کے لئے دعا رمانگی کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ سلطان کے ساتھ تمام نمازی بھی اسی طرح زار وقطار روتے تھے۔ اس کے بعد سلطان نے کہا " جو شخص واپس جانا چاہتا ہے وہ بخوشی واپس چلا جائے۔ یہاں اب کوئی ایسا سلطان نہیں ہے جو امرونہی کرتا ہو۔ یہ کہکر سلطان نے تیر و کمان الگ دیئے اور تلوار و سنان زیب تن کر کے گھوڑے کی دم اپنے ہاتھ سے باندھی۔ پھر سپید کپڑے پہنے ان پر خوشبو لگائی اور کہا کہ اگر قتل کردیا جاؤں تو بس یہی سپید کپڑے میرا کفن ہونگے۔ اب رومی اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہو گئے سلطان نے پہلے گھوڑے پہ سوار ہو کر دشمن پر اس زور کا حملہ کیا کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بیشمار آدمی مارے گئے خود شاہِ روم گرفتار کرلیا گیا۔ سلطان الپ ارسلان کے سامنے پیش ہوا تو کچھ گفتگو کے بعد ایک بہت بڑی رقم فدیہ لیکر متعدد شرطوں کے ساتھ اسے رہا کردیا گیا۔

اس جنگ میں بیشمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا جو عمدہ نسل کے گھوڑوں اور بہترین ہتھیاروں اور دوسرے قسم کے ساز وسامان پر مشتمل تھا۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور مسلمانوں کی فوجی طاقت اس قدر مضبوط ہو گئی کہ رومیوں کو اس کے بعد پھر کبھی آذربیجان اور آرمینیہ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ فتوحات کے علاوہ سلطان الپ ارسلان کو تعمیری کاموں سے بھی بڑا شغف تھا چنانچہ اسی کے عہد میں وزیر نظام الملک نے بغداد میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد رکھی۔ ۴۶۵ھ میں چین کو فتح کرلینے کے ارادہ سے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ روانہ ہوا۔ لیکن ابھی دریائے جیحون کو ہی پار کیا تھا کہ موت کا پیغام آپہنچا۔

مورخینِ اسلام نے سلطان الپ ارسلان کے عہد کو اسلام کا دورِ ترقی وعروج کہا ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ اخلاق وعادات، عمل واعتقاد اور سیرت کے لحاظ سے سلطان نے اپنے بلند کیرکٹر کا جو نقش

تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ سلطان کی سلطنت میں خلافت کی جھلک نظر آتی تھی سلطان کی مملکت بہت وسیع تھی علامہ ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں۔

ودان لہ العالم وبحق قیل لہ — عالم سلطان کا مطیع تھا اور اس کو "سلطانِ عالم"

سلطان العالم [1] — بجا طور پر کہا جاتا تھا۔

بنو حمدان | ۳۳۰ھ میں حلب میں بنو حمدان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس خاندان کا گل سرسبد سیف الدولہ ابوالحسن علی بن ابی الہیجا تھا جس نے ابن خلکان کی روایت کے مطابق رومیوں سے چالیس مرتبہ جہاد کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ ان غزوات میں میدانِ جنگ کا جو گرد و غبار اڑ کر سیف الدولہ کے چہرہ پر پڑتا تھا سیف الدولہ اس کو جمع کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ وفات کے وقت اس نے وصیت کی کہ جمع شدہ غبار سے ایک اینٹ بنائی جائے اور اسے لحد میں میرے سرہانے رکھدیا جائے۔"

ابو الطیب متنبی سیف الدولہ کے دربار کا مشہور شاعر تھا اس نے اپنے قصائد میں کثرت سے سیف الدولہ اور قسطنطین و دمستق ملک روم کے حالاتِ جنگ کا ذکر کیا ہے اور رومیوں کی زبوں حالی اور پسپائی، قسطنطین کا قتل اور بطارقہ کی اسارت وغیرہ کا حال بیان کرکے سیف الدولہ کے غیر معمولی جذبۂ جہاد اور حیرت انگیز شجاعت و دلیری کی بڑی تعریف کی ہے۔

تاتاری حملے اور ان کا جواب | صلیبیوں کی طرح ساتویں صدی ہجری کے وسط سے تاتاریوں نے ممالک اسلامیہ پر بڑے زور سے حملے شروع کر دیئے تھے یہاں تک کہ ۶۵۶ھ میں خلافتِ بغداد کا خاتمہ انھیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ بغداد کو تباہ کرنے کے بعد ان کے حوصلے دو چند ہو گئے اور انھوں نے دمشق اور سواحلِ شام پر قابض ہونے کے بعد اب مصر کا بھی ارادہ کیا۔

مصر میں دولتِ ایوبی کے خاتمہ کے بعد ۶۴۸ھ میں ممالیک بحریہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس وقت

[1] یہ تمام واقعات ابن اثیر الجزری ج ۱۰۔ از صفحہ ۲۲ تا صفحہ ۲۶ سے ماخوذ ہیں۔

اس خاندان کے پہلے فرمانروا معزجاشنیگر کے قتل ہو جانے کے بعد اس کا پانزدہ سالہ لڑکا "ملک منصور نورالدین" تخت سلطنت پر متمکن تھا اور سیف الدین محمود قطوزی جو بعد میں ملک مظفر سیف الدین کے لقب سے معروف ہوا، ملک منصور کی اتالیقی کرتا تھا، تاتاریوں کے سیل بلا نے جب دمشق اور سواحلِ شام میں نقل و حرکت شروع کی تو قطوزی نے ملک کے بڑے بڑے علما ارباب رائے اور امرا کو جمع کر کے کہا کہ :-

"تاتاری مرکزِ خلافت کو تباہ کر چکے ہیں اب شام کی طرف آئے ہیں یقین ہے کہ اس سے فارغ ہو کر مصر کا بھی رخ کریں گے یہ وقت اسلامی سلطنتوں کے لئے بڑا سخت ہے۔ اس بنا پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مصر کے تخت پر ایک ناآزمودہ کار بچہ کے بجائے ایسا تجربہ کار اور ہوشیار شخص بیٹھے جو وقت کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکے۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور آخر کار ۶۵۷ھ میں ملک منصور کو تخت سے اتار کر خود قطوزی کو ہی مصر کا بادشاہ بنا دیا گیا جس نے ملک مظفر اپنا لقب رکھا۔

جو خطرہ تھا وہ ظہور میں آ کے رہا۔ ہلاکو نے دمشق اور سواحلِ شام پر قبضہ کر لینے کے بعد مصر کا رخ کیا، مگر حملہ آور ہونے سے پہلے ملک مظفر کو لکھا کہ تم اپنا ملک لڑے بغیر ہی میرے حوالہ کر دو، ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو بغداد کا ہوا۔ مصری فوج نہایت بہادر تھی۔ کئی معرکوں میں صلیبیوں سے زور آزما کر انھیں شکست دے چکی تھی۔ اس لئے اس نے ہلاکو خاں کی دھمکی کی ذرا پرواہ نہ کی اور لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ ۶۵۸ھ کے ماہ شوال میں عین الجالوت میں جو فلسطین کے مضافات میں سے ہے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تاتاری فوج کا کمانڈر کتبغا قتل ہو گیا اس کا بیٹا قید ہوا اور مصریوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔

اب ملک مظفر سیف الدین کے حکم سے رکن الدین بیبرس بندقداری تاتاریوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور آخر کار انھیں ملک شام کی سرحد سے باہر نکال کر رہا۔

ملک ظاہر بیبرس ملک مظفر سیف الدین نے بیبرس بندقداری سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے تاتاریوں کو شام سے نکال دیا تو وہ اس کو حلب کا والی بنا دیگا۔ لیکن بیبرس جب کامیاب ہو کر واپس آیا اور اس نے ولایتِ حلب

کی شرط پوری کردی تو ملک مظفر اپنے وعدہ سے منحرف ہوگیا۔ بیبرس نے مشتعل ہو کر چند ممالیک سے ساز باز کرلیا اور ملک مظفر کو جبکہ وہ سفر میں ہی تھا سپرد تیغ کر دیا۔ اس کے بعد رکن الدین بیبرس خود ۶۵۸ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا اور اپنے وزیر زین الدین کے ایما سے اپنا لقب بجائے ملک قاہر کے ملک ظاہر رکھا۔[۱]

ملک ظاہر رکن الدین بیبرس بندقداری کا عہد سلطنت مصر کی اسلامی تاریخ میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے یہ اگرچہ ملک مظفر سیف الدین کا چاؤش تھا۔ مگر نہایت بلند اخلاق، مدبر، بہترین سپہ سالار، شریعت کا پابند اور عدل گستر و رحم دل تھا۔ اس نے اندرونی انتظامات میں ان تمام مفاسد کی اصلاح کی جو ملک مظفر سیف الدین کے عہد حکومت میں پیدا ہو چکے تھے اس سلسلہ میں اس نے ان تمام ناجائز ٹیکسوں اور محصولات کو بھی یکقلم موقوف کر دیا جو اس کے تخت نشین ہونے سے پہلے سے چلے آرہے تھے۔

فرقہ باطنیہ کا استیصال دولت فاطمیہ کے زمانہ میں فرقۂ باطنیہ نے بڑا فروغ پایا تھا اور اگرچہ ہلاکو نے ان کا زور بہت کچھ توڑ دیا تھا۔ مگر ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا، ملک ظاہر کے عہد میں ان لوگوں نے پھر شورشیں برپا کرنی شروع کیں تو اس نے ان سب کو تہ تیغ کر دیا اور ان کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گمراہ ترین جماعت ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئی۔

تاتاریوں پر مسلسل فتحیابیاں اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر سلطان رکن الدین بیبرس نے تاتاریوں کی طرف توجہ کی جنھوں نے عراق عجم اور شام و فلسطین کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا میدان بنا رکھا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملک مظفر سیف الدین کے عہد میں جب تاتاریوں کو عین الجالوت میں شکست ہوئی تھی تو ملک ظاہر بندقداری نے ان لوگوں کا تعاقب کیا تھا اور شام کے حدود سے نکال دیا تھا۔ اب بندقداری کے عہد سلطنت میں تاتاریوں نے شام پر پھر یورش کی۔ ملک ظاہر نے ان کے مقابلہ کے لئے امیر قلاؤن کو بھیجا جس نے تاتاریوں کو متواتر شکستیں دیکر سرزمین شام کو ان کے وجود سے پاک کر دیا۔

---

[۱] یہ سب واقعات حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و قاہرۃ ج ۲ ص ۳۶ سے ماخوذ ہیں۔

۶۷۵ھ میں تاتاریوں نے ہلاکو کے لڑکے اباقاخاں کی قیادت میں عراق عجم پر بڑے ساز و سامان اور شوکت و حشم کے ساتھ حملہ کیا۔ ملک ظاہر خود مقابلہ و مبارزہ کے لئے پہنچا۔ نہایت خونریز جنگ تھی طرفین سے بیشمار آدمی مارے گئے لیکن آخر میں فتح مسلمانوں کی ہی رہی۔ تاتاری نہایت ذلیل ہو کر بھاگ گئے۔

صلیبی اگرچہ بہت کمزور ہو چکے تھے لیکن تاتاریوں کی طرح شورش برپا کرتے رہتے تھے۔ ملک ظاہر بیبرس نے اس سے بھی غفلت نہیں برتی چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد صلیبیوں نے شام کے جن علاقوں پر قبضہ جما لیا تھا ملک ظاہر ۶۶۳ھ و ۶۶۴ھ میں دو سال تک برابر ان کے ساتھ لڑتا رہا اور آخرکار شام کے ایک ایک شہر سے ان کو نکال کر دم لیا۔

اس سے فارغ ہو کر مصر آیا۔ یہاں پھر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور جب وہ مکمل ہو گئیں تو ۶۶۶ھ میں فلسطین کے صلیبیوں پر حملہ کیا وہاں سے انطاکیہ بلکہ اس سے بھی آگے مقام مرقیہ تک فتح کرتا چلا گیا، یہاں سے فارغ ہو کر اس نے بغداد کا رخ کیا اور آخرکار اسے بھی تاتاریوں کے قبضہ سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ قیساریہ جو کسی زمانہ میں آلِ سلجوق کا پایۂ تخت رہ چکا تھا اور اب آج کل وہ صلیبیوں کے قبضہ میں تھا جہاں سے یہ لوگ مسلمانوں پر حملے کرتے رہتے تھے ملک ظاہر بیبرس نے ۶۷۵ھ میں اس کو بھی فتح کر لیا۔

غرض یہ ہے کہ اندرونی انتظامات، عدل گستری و انصاف پروری اور فتوحات ان سب امور کے لحاظ سے ملک ظاہر بیبرس کا عہد حکومت مسلمانوں کی خوش بختی کا ایک روشن نشان ہے۔ مصر کے دوسرے عباسی خلیفہ نے اپنے خطبہ میں بالکل صحیح کہا تھا کہ "جب دشمن (تاتاری) ہمارے گھروں میں گھس آئے تھے اور انھوں نے قیامت کے فتنے برپا کر رکھے تھے۔ ایسے نازک وقت میں سلطان رکن الدین بیبرس اپنی چھوٹی سی سلطنت کے باوجود امتِ مسلمہ کی امداد و اعانت کے لئے اٹھے اور انھوں نے کفر کے لشکروں کو منتشر کر کے رکھ دیا۔"[۵۱]

---

۵۱ حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۴۸۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں "دوسری بڑی بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں ملک ظاہر کی حکومت ایسی ہے جیسے ایک سمندر کے سامنے کوئی نہر یا چھوٹا سا دریا. لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ دین حق میں جو رخنے پڑ گئے تھے اور مسلمانوں پر جو آفتیں اور مصیبتیں تو بر تو نازل ہو رہی تھیں ان سب کا انسداد اسی چھوٹی سی حکومت کے ذریعہ ہو" ؎۱

ان کارناموں کے علاوہ ملک ظاہر کے ذاتی اخلاق و عادات سے متعلق مورخین نے جو واقعات نقل کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ملک ظاہر کہنے کو غلام تھا مگر درحقیقت اس پر عباسی خاندان کے کئی بڑے بڑے شریف النسب خلفاء قربان کئے جا سکتے تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے" ۹ رجب ۶۶۰ھ کو ایک کنوئیں کے معاملہ میں رکن الدین بیبرس قاضی تاج الدین کے محکمۂ عدالت میں آیا۔ اس وقت جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ قاضی نے بھی کھڑا ہونا چاہا مگر ملک ظاہر نے ہاتھ کے اشارہ سے انھیں منع کر دیا اب عدالت میں باقاعدہ مقدمہ پیش ہوا۔ سلطان نے حکم شرعی کے مطابق مدعی ہونے کی حیثیت سے بینۂ عادلہ پیش کیا اور فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا ؎۲

۶۶۷ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوا تو تمام کعبہ کو خود اپنے ہاتھ سے عرق گلاب سے دھویا پھر مدینہ طیبہ پہنچکر روضۂ اقدس کی زیارت کی۔ وہاں دیکھا کہ لوگ قبر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بہت قریب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں یک گونہ گستاخی پائی جاتی تھی۔ ملک ظاہر نے قبر مبارک کے چاروں طرف ایک کٹھرا بنوا دیا جو اب تک موجود ہے۔

محکمہائے عدالت میں جدت یہ کی کہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے مسلک کا الگ الگ ایک قاضی مقرر کیا۔ صدقات و خیرات بہت کثرت سے کرتا تھا۔ رمضان میں جگہ جگہ فقراء اور مساکین کے لئے

؎۱ حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۶۷۔ ؎۲ ایضاً ص ۶۶۔

بڑے بڑے مطبخ کھلوا دیا تھا جہاں ان کے افطار و سحر کے لئے نوع بنوع کھانے تیار کئے جاتے تھے۔ بڑی بڑی جائدادیں اس لئے وقف تھیں کہ ان سے غریبوں اور محتاجوں کی تکفین و تدفین کا انتظام ہو۔" ؎۱

ملک ظاہر فتح قیساریہ کے بعد دمشق میں مقیم تھا کہ وہیں بیمار ہو کر محرم ۶۷۶ھ میں انتقال ہوا۔

تاتاریوں کا اسلام

ملک ظاہر کے بعد بھی تاتاریوں کی شورشیں برابر جاری رہیں چنانچہ ۶۸۰ھ میں ہلاکو کے دو بیٹوں اباقا خاں اور منگو تیمور نے شام پر پھر بڑے زور شور سے لشکر کشی کی فوج کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف منگو تیمور کی قیادت میں جو لشکر تھا اسی ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ ممالیک بحریہ کے سلسلہ کا پانچواں فرماں روا ملک منصور سیف الدین قلاؤدن اس زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا۔ اس نے یہ خبر سنکر اپنی فوج مرتب کی اور مقابلہ کے لئے بڑھا حمص کے قریب ۱۴ رجب المرجب کو نہایت گھمسان کا رن پڑا جس میں منگو تیمور مارا گیا اور اباقا خاں شکست کھا کر حمدان چلا گیا۔ یہاں اس کے بھائی نیکودار اوغلان نے اسے زہر دیکر مار ڈالا اور خود تختِ حکومت پر قابض ہو گیا پھر اسلام قبول کر کے اپنا نام احمد خاں رکھا۔ اور اب مصریوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے یہاں تک کہ دونوں میں باہمی تعاون و اشتراک کا ایک عہد نامہ بھی لکھا گیا۔

بادشاہ احمد خاں کے مسلمان ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے یہاں تک کہ قوبیلائے قاآن کے پوتے انندہ سلطان جوختا کا حاکم تھا اس نے بھی اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور شب و روز عبادت میں بسر کرنے لگا۔ واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

غور کیجئے کیا یہ امر اسلام کے قیامت تک باقی رہنے کی دلیل نہیں ہے کہ جو تاتاری پچاس سال تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے شدید ترین وبال جان بنے رہے اور جنھوں نے اسلامی حکومتوں اور مسلمان آبادیوں کو تباہ و برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اب وہ خود اسلام کے حلقہ بگوش

؎۱ حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۶۶۔

بن جاتے ہیں اور اب ان کی تمام جنگی اور انتظامی صلاحیتیں اسلام کی سربلندی و سرفرازی کی کوششوں میں صرف ہوتی ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے :-

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

خلافتِ عباسیہ بغداد کا ہیرو کون تھا؟

بغداد کی خلافت بنی عباس پر گفتگو کے آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک اس خلافت کا ہیرو کون تھا۔ تاکہ آپ کو بوضاحت معلوم ہو سکے کہ ہمیں ایک خلیفہ یا سلطان کو کس معیار پر جانچنا چاہیے اور کون شخص اسلامی نقطۂ نظر سے کسی سلطنت یا خلافت کا ہیرو بن سکتا ہے۔

عام مورخینِ اسلام مامون رشید کو خلافتِ بنی عباس کا ہیرو کہتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس شرف کا جامہ اگر خلفاء بنی عباس میں سے کسی کے قامتِ موزوں پر راست آتا ہے تو وہ دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ہے اگرچہ سفاح کی طرح اس کے مزاج میں بھی تشدد اور سخت گیری کا غلبہ تھا۔ چنانچہ اس نے علویہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس معاملہ سے کم نہیں تھا جو سفاح نے بنو امیہ کے ساتھ کیا تھا۔ تاہم اس کی ذہنیت بڑی حد تک اسلامی تھی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ ایک خلیفۂ اسلام کا فرض محض علوم و فنون کی اشاعت نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑھکر اس کا اہم اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال و اخلاق کی نگرانی کرے، بد عقیدتی سے ان کو بچائے ان کے لئے کسب و اکلِ حلال کے وسائل و ذرائع مہیا کرے، سوسائٹی کو برے رسوم و عادات سے محفوظ رکھے اور سیاسی طاقت و قوت کو اتنا مضبوط بنا دے کہ دشمنوں کو اس پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکے۔

منصور کے عہد میں اخلاق اسلامی کی نگرانی

اس احساسِ فرض کے باعث منصور نے ایک طرف تو طرابلس الشام وغیرہ میں رومیوں نے جو شورشیں پیدا کر رکھی تھیں ان کو دبا دیا۔ ... ان ملک خراسانیوں کے بل بوتے پر جو لوگ اپنے اہوائِ فاسدہ کو بروئے کار لانا چاہتے تھے ان کی سرکوبی کی اور دوسری جانب

اس نے اس بات کی سخت نگرانی رکھی کہ مسلمان لہو ولعب اور مخرب اخلاق مشاغل سے مجتنب رہیں خلیفہ ہونے کے باوجود خود اس کا یہ حال تھا کہ مورخ طبری[سلہ] کے بیان کے مطابق محل شاہی میں ایک دن کے سوا لہو ولعب یا کوئی لغویات کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ایک مرتبہ اسے محل میں کچھ شور سنائی دیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک جگہ گانا ہو رہا ہے فوراً جوتہ پاؤں میں ڈال روانہ ہوگیا۔ موقع پر پہنچ کر دیکھا کہ ایک غلام طنبورہ بجا رہا ہے اور چند باندیاں جو اس کے ارد گرد جمع ہیں ہنس ہنس کر داد دے رہی ہیں۔ منصور کو دیکھتے ہی یہ مجمع منتشر ہوگیا۔ اب اس نے حکم دیا کہ طنبورہ غلام کے سر سے دے مارا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور طنبورہ ٹوٹ گیا۔ اس واقعہ کے بعد منصور نے غلام کو اپنے پاس رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور اسے محل سے نکال کر فروخت کرا دیا۔ اس کے علاوہ منصور کو شراب نوشی سے بھی نفرت تھی خود تو پیتا ہی نہیں تھا، دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اپنے دسترخوان پر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بختیشوع طبیب مہمان شاہی ہوا اور اس کے سامنے منصور کے حکم سے کھانا رکھا گیا تو اس میں شراب نہیں تھی۔ بختیشوع چونکہ عیسائی تھا اور مذہباً اس کے لئے شراب جائز تھی اس لئے اس نے دسترخوان پر شراب کا مطالبہ کیا، جواب ملا "انّ الشراب لا یشرب علیٰ مائدۃ امیر المؤمنین" امیر المومنین کے دسترخوان پر شراب نہیں پی جا سکتی۔ بختیشوع بولا "تو پھر میں کھانا بھی نہیں کھاؤنگا۔ منصور کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بختیشوع کی کوئی پروا نہیں کی اور کہنے لگا "اچھا وہ کھانا شراب کے بغیر نہیں کھا سکتا تو نہ کھائے"۔ یہ واقعہ صبح کے کھانے کے وقت پیش آیا تھا شام کو جب کھانا آیا تو بختیشوع نے پھر دسترخوان پر شراب کی خواہش ظاہر کی۔ اس مرتبہ پھر اس کو وہی جواب ملا مگر اب اس نے کھانا کھایا اور اس کے بعد دجلہ کا پانی پیا تو بولا "میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی چیز شراب کی قائم مقام بھی ہو سکتی ہے لیکن واقعی دجلہ کا پانی پی کر شراب پینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔[سلہ۲]

سلہ طبری ج ۹ ص ۲۹۴۔ سلہ۲ طبری ج ۹ ص ۳۰۹۔

منصور عام خلفاء بنی عباس کے برخلاف فضول خرچی اور اسراف و تبذیر سے بھی سخت پرہیز کرتا تھا۔ کسی شاعر کے کسی شعر سے اگر خوش ہوتا بھی تھا تو اُسے بہت معمولی سی رقم دیکر خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ بصرہ کے قاری ہشیم نے منصور کے سامنے آیت "ولا تبذر تبذیرا" پڑھی تو اس نے دعا مانگی:-

"اے اللہ تو مجھکو اور میری اولاد کو اُن چیزوں میں فضول خرچی کرنے سے بچا جو تم نے اپنے لطفِ خاص سے ہم کو مرحمت فرما رکھی ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہر چیز میں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں اور لینے دینے میں میانہ روی کو ملحوظ رکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ خزانہ قوم کی امانت ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس امانت کو اپنے ذاتی حظِ نفس میں صرف کرے۔

منصور کے سلیم الطبع ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی فعل و عمل پر کسی کی زبان سے نکتہ چینی سن کر چین بجبیں نہیں ہوتا تھا، بلکہ اگر بات حق ہوتی تھی تو اُسے فوراً قبول کر لیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ افریقیہ کا ایک قاضی دربارِ خلافت میں حاضر ہوا جو طالب علمی میں منصور کا ساتھی رہ چکا تھا منصور نے اس سے پوچھا "تم کو میری حکومت اور بنو امیہ کی حکومت میں کیا فرق نظر آیا اور تم اس طویل سفر میں ہمارے جن جن علاقوں سے گذرتے ہوئے آئے ہو ان میں نظم و نسق کا کیا حال ہے؟ قاضی نے جواب دیا:- "اے امیر المومنین! میں نے اعمالِ بد اور ظلم و جور کی کثرت دیکھی ہے، پہلے تو میرا گمان یہ تھا کہ اس ظلم و جور کا سبب آپ کا ان علاقوں سے دور ہونا ہے لیکن میں جتنا قریب آتا گیا معاملہ اسی قدر نازک ہوتا گیا" خلیفہ منصور نے یہ سن کر اپنی گردن جھکالی، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا "مگر میں لوگوں کا کیا کروں؟" قاضی نے جواب دیا "کیا آپ کو معلوم نہیں ہے حضرت عمر بن عبد العزیز فرماتے تھے لوگ بادشاہِ وقت کے تابع ہوتے ہیں۔ بادشاہ اگر نیک ہوگا تو رعایا بھی نیک اور صالح ہوگی اور اگر بد ہے تو رعایا نیک نہیں ہو سکتی"۔

منصور کی عاقبت اندیشی، دور بینی، سیاسی مہارت و بصیرت اور نیک نیتی کا اندازہ اس

وصیت نامہ سے ہو سکتا ہے جو اس نے وفات سے چند روز پہلے اپنے بیٹے مہدی کو دیا تھا۔ ابن جریر نے طبری میں اور ابن اثیر الجزری نے کامل میں اس وصیت نامہ کو بتمام وکمال نقل کیا ہے۔ الفاظ میں اختلاف ہے مگر دونوں کا حاصل ایک ہے ذیل میں اس کا خلاصہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"اے بیٹے! کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو میں نے تمہارے لئے ہموار اور مہیا نہ کر دی ہو۔ میں تم کو چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ میرا گمان ہے کہ تم ان میں سے ایک پر بھی عمل نہیں کروگے" یہ کہکر منصور نے ایک صندوقچی منگوائی جس میں متعدد رجسٹر تھے۔ یہ صندوقچی مقفل رہتی تھی اور سوائے کسی ایک معزز شخص کے کوئی اور اس کو نہیں کھول سکتا تھا۔ منصور نے صندوقچی کھول اور اس میں سے رجسٹر نکال مہدی کے حوالے کئے اور کہا کہ تم ان کو بڑی حفاظت سے رکھنا۔ ان میں تمہارے آبا کا علم محفوظ ہے۔ اگر کوئی اہم معاملہ پیش آجائے تو پہلے بڑے رجسٹر میں اس کا جواب تلاش کرنا اگر اس میں نہ ملے تو پھر دوسرا اور تیسرا رجسٹر دیکھنا اسی طرح ساتوں رجسٹر دیکھ جانا۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی تمہارے سوال کا جواب نہ ملے تو پھر چھوٹا رجسٹر دیکھنا۔ مجھکو یقین ہے کہ اس میں تم کو اپنے معاملہ کے متعلق ضرور کوئی ہدایت ملیگی۔

اس کے بعد منصور نے بعض امور کی نسبت مہدی کو خاص خاص ہدایتیں کیں اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا۔

(۱) شہر بغداد کا خاص خیال رکھنا۔

(۲) میں نے بیت المال میں اس قدر روپیہ جمع کر دیا ہے کہ اگر دس برس تک بھی تم کو خراج کی رقم پوری وصول نہ ہو تو تمہیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ تم اس روپیہ کو لشکریوں کی تنخواہوں مستحقین کے وظائف وعطیات اور سرحدوں کے انتظامات پر خرچ کرنا۔

(۳) اہل خاندان اور اعزا و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی اور لطف کا معاملہ کرنا کہ انہی سے

---

[۱] طبری ج ۹ ص ۳۱۹ [۲] کامل ج ۶ از ص ۶ تا ص ۷۔

تمہاری عزت و آبرو ہے۔

(۴) ہر کام میں تقویٰ و طہارت اور عدل و انصاف کا خیال رکھنا کیونکہ جس بادشاہ میں یہ اوصاف نہیں ہیں درحقیقت وہ بادشاہ ہی نہیں۔

(۵) کسی معاملہ میں عورتوں کو مشیر کار نہ بنانا۔ اور جب تک کسی معاملہ میں خوب غور و خوض نہ کرلو اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنا۔

منصور کو یقین تھا کہ اس نے جو وصیت لکھی تھی وہ اس کی موت کے بعد شرمندۂ عمل نہیں ہوگی اسی لئے اس نے ہر جملہ کے بعد "وما اظنک تفعل" میرا گمان ہے کہ تم اسے نہیں کروگے" کہا ہے۔

منصور کے بعد ۱۵۸ھ میں مہدی خلیفہ ہوا۔ اس نے اپنے عہدِ خلافت میں متعدد اچھے اور تعمیری کام کئے لیکن سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زنادقہ کے اس فتنہ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا جو متعدد اسباب و وجوہ سے مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کا امیر عمر الکلواذی نام ایک شخص تھا اس محکمہ کے لوگوں کا کام یہ تھا کہ وہ ڈھونڈ کر زندیقوں اور ملحدوں کو پکڑ کر لاتے تھے اور پھر ان کو قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ بشار بن برد اس زمانہ کا ایک مشہور زندیق شاعر تھا۔ ایک مرتبہ مہدی بصرہ میں آیا اس کے ساتھ حمدویہ تھا جو زندیقوں کی جستجو اور ان کا کھوج لگانے کی خدمت پر مامور تھا یہاں کہیں بشار حمدویہ کے ہاتھ لگ گیا۔ مہدی کے سامنے اس کا معاملہ پیش ہوا تو اس نے حمدویہ کو حکم دیا کہ اسے سخت ترین سزا دی جائے۔

لیکن مہدی کا یہ اقدام وقتی اور ہنگامی طور پر تو مفید ہوا۔ زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتا تھا اس کی وجہ صاف ظاہر ہے یعنی یہ کہ زندقہ و الحاد جن اسباب سے پیدا ہو رہا تھا ان کے استیصال کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ حرم شاہی میں غلمان و جواری کا عمل دخل بڑھ رہا تھا۔ دربار میں بدعقیدہ عجمیوں کے اثرات ترقی کر رہے تھے اور عام مجالس و محافل میں ابو نواس اور بشار بن برد ایسے مطلق العنان شاعر زندی و مے مستی کے

جذبات پیدا کر رہے تھے۔ مدارس و مکاتب میں درس قرآن و حدیث کے بالمقابل فلسفہ و عقلیات نے اپنی ایک مستقل درس گاہ قائم کر لی تھی۔ سامان عیش و عشرت کی فراوانی نے عہدِ شباب کی لذت اندوزیوں کے ارمانوں کو دلوں میں بیدار کر دیا تھا۔ محتسب خود پیرِ مغاں کے دستِ کرم پر بیعت کر چکا ہو تو میخانہ کے دروازہ پر قفل کون لگائے؟

اذا کان ربّ البیت بالطبل ضاربًا　　　فلا تلموا ولا ولاد فیہ علی الرقص

جب صاحب خانہ ہی طبل بجا رہا ہو تو گھر میں اولاد کو ناچنے پر ملامت نہ کرو۔

علامہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ کی جلد اول کے شروع میں بعض محدثین اور علماءِ ربانیین کے وہ اقوال و اشعار نقل کئے ہیں جو انھوں نے بغداد سے متعلق کہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لہو و لعب اور عیش و طرب کی اس فضاءِ رنگین میں خدا کے ایسے پاک بندے بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جو تقویٰ و طہارت اور ثقاہت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس صورتِ حال پر سخت مضطرب اور پریشان تھے لیکن ان بزرگوں کی حالت اس شعر کا مصداق تھی۔

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد　　　کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

مصر میں خلافتِ عباسیہ کا دوبارہ قیام

فتنۂ تاتار کی بادِ صرصر سے بغداد میں خلافتِ بنی عباس کا چراغ گل ہو گیا تو ساڑھے تین سال تک (۱۴ صفر ۶۵۶ھ سے رجب ۶۵۹ھ تک) مسند خلافت بالکل خالی پڑا رہا۔ یہاں تک کہ ابوالقاسم احمد جو ظاہر بامر اللہ کا بیٹا، خلیفہ مستعصم کا چچا اور مستنصر کا بھائی تھا اور جو بغداد میں مستعصم کے قتل کے وقت قید تھا کسی طرح رہا ہو کر چند لوگوں کی معیت میں عراق آیا پھر اس نے مصر کا ارادہ کیا۔ سلطان رکن الدین بیبرس نے قاضی تاج الدین اور وزراء، علما اور دیگر اعیان و امراء کے ساتھ آگے بڑھ کر استقبال کیا اور اس خوشی میں تمام شہر کی بڑے پیمانہ پر آئینہ بندی کرائی۔ بروز دوشنبہ ۱۳ رجب المرجب خاص دیوانِ شاہی میں ایک بڑا شاندار اجتماع ہوا۔ جس میں سلطان اور ابوالقاسم احمد کے

علاوہ تمام علماء اور وزراء و امراء اپنے اپنے مدارج کے مطابق شریک تھے۔ اس اجتماع میں قاضی تاج الدین کے نزدیک جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ابوالقاسم واقعی اپنے دعویٰ نسب میں سچا ہے اور قاضی القضاۃ نے بھی کھڑے ہوکر اس کا اقرار کرلیا تو سب سے پہلے شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے ابوالقاسم کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔ پھر سلطان رکن الدین نے اور سلطان کے بعد قاضی تاج الدین نے اور پھر تمام شرکاءِ اجتماع نے بیعت کرلی۔ اب اس نے اپنے بھائی کے لقب پر اپنا لقب بھی مستنصر باللہ رکھا۔ اور خطبوں میں اور سکوں میں اسی کا نام رائج ہوگیا اس طرح مصر میں دوبارہ خلافت عباسیہ کا قیام ہوا۔

۱۷ رجب کو جمعہ کے دن خلیفہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ ایک شاندار جلوس کی صورت میں جامع مسجد آیا۔ یہاں ایک خطبہ پڑھا جس میں بنو عباس کے شرف و مجد کا ذکر تھا اور سلطان رکن الدین بیبرس کے لئے دعائیں کی گئی تھیں۔ اس کے بعد منبر سے اتر کر نماز پڑھائی۔ مسلمان جو اس وقت یہاں موجود تھے اس منظر سے بڑے متاثر ہوئے۔ پھر دوسرے مہینے یعنی ۴ شعبان المعظم کو قاہرہ کے باہر ایک میدان میں ڈیرے خیمے لگا دئے گئے تھے۔ خلیفہ اور سلطان وزراء اور اعیان دربار کے ساتھ یہاں مجتمع ہوئے اور یہیں خلیفہ نے پہلے اپنے ہاتھ سے سیاہ خلعت اور سیاہ عمامہ سلطان کو پہنایا پھر تمام بلادِ اسلامیہ کے معاملات کا نظم و نسق سلطان کے حوالہ کرکے اسے "امیرالمومنین" کے لقب سے مشرف کیا۔ [۱]

اس میں شبہ نہیں کہ علماءِ کرام اور سلطان نے بڑی حد تک دینی جذبہ کے ماتحت ہی خلافت کا احیاء کیا تھا وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ تمام مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز سے وابستہ رکھنے کے لئے خلافت کا قیام کس درجہ ضروری ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ خلافت محض برائے نام ہی خلافت تھی اور اس سے وہ مقصد کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا تھا جو اسلام کے خلیفۂ وقت سے حاصل ہونا چاہئے تھا جیسا کہ ابھی معلوم ہوچکا ہے۔ خلیفہ کے اقتدار اور اس کی سیاسی طاقت و قوت کا یہ حال تھا کہ سلطان رکن الدین

---

[۱] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۴۴ و ۴۵۔

بیبرس، جس کے لطف وکرم سے اس کو خلافت کی مسند پر بیٹھنا نصیب ہوا تھا، اس کو خلیفہ از خود "امیر المومنین" کا لقب دیتا ہے حالانکہ یہ لقب خلیفہ کے سوا کسی اور کے لئے موزوں نہ تھا اور پھر تمام بلادِ اسلامیہ کے معاملات کا انصرام وانتظام سلطان کے سپرد کر کے خود فارغ ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ گویا بحیثیت خلیفہ اس کو نہ اب کوئی کام کرنا ہے اور نہ اس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے۔

کہنے کو مستنصر باللہ خلیفہ تھا لیکن دراصل پورا اقتدار رکن الدین بیبرس کے ہاتھ میں تھا۔ خلیفہ کی حیثیت محض ایک تبرک کے مانند تھی جس کے وجود کو پرانے زمانہ کی کسی رسمی یادگار کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا ہو۔ دوسرے ملوک وسلاطین اسلام پر تو اس خلافت کا کیا اثر ہوتا۔ خود مصر میں اس کا کوئی وقار نہیں تھا سلطان رکن الدین چونکہ ذاتی طور پر نہایت بلند اخلاق کا مسلمان تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی میں خلافت کا قرار واقعی احترام باقی رکھا۔ لیکن ایک ہی نیام میں دو تلواریں آخر کب تک تصادم سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان بیبرس کے چند سال بعد ہی تیسرے خلیفۂ عباسی مستکفی باللہ اول (از ۷۰۱ھ تا ۷۴۰ھ) کو سلطان مصر محمد بن قلاؤون نے کسی بات پر ناراض ہو کر ۷۳۶ھ میں برج قصر میں نظر بند کر کے لوگوں کو اس سے ملنے جلنے سے منع کر دیا پھر ۷۳۷ھ میں اس کو مع اہل وعیال ودیگر متعلقین قاہرہ سے نکالکر مقام قوص میں بھیجدیا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ آئندہ سے کسی خطبہ میں مستکفی کا نام نہ لیا جائے۔ شعبان ۷۴۰ھ میں وفات پائی مرتے وقت مستکفی نے وصیت کی تھی کہ اس کے بعد اس کے بیٹے احمد کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ لیکن سلطان مصر نے اس کی بھی پروا نہیں کی اور حاکم بامر اللہ کے پوتے ابراہیم بن محمد کو واثق باللہ کا لقب دیکر خلیفہ بنا دیا۔ لیکن اس کی خلافت بھی برائے نام ہی تھی خطبوں تک میں اس کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔

محمد بن قلاؤن کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین ابوبکر مصر کا سلطان ہوا۔ اس نے ۷۴۱ھ میں ایک دربار عام کیا اور اس میں قاضی القضاۃ سے مشورہ لینے کے بعد واثق باللہ کو معزول کر کے اس کی جگہ احمد بن مستکفی کو خلیفہ بنا دیا۔

غرض یہ ہے کہ مصر کا عباسی خلیفہ سلطان مصر کے رحم وکرم پر جیتا تھا۔ وہ کسی سیاسی اقتدار کا مالک نہ تھا۔ خلیفہ سلطان کے دست اقتدار میں بازیچۂ طفلاں سے کم نہ تھا۔ اس بنا پر بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز اور شرمناک واقعات بھی پیش آجاتے تھے چنانچہ خلفاء عباسیہ مصر کے سلسلہ کے ساتویں خلیفہ متوکل علی اللہ کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا۔ ۷۶۳ھ میں متوکل خلیفہ بنایا گیا تھا لیکن سلطان مصر ایک بدگمانی کے باعث اُس سے ناراض ہوگیا۔ اس نے خلیفہ کو نظر بند کر کے قوص بھیجدیا اور اس کی جگہ ذکریا بن واثق کو خلیفہ بنا کر معتصم کا لقب دیدیا۔ لیکن یہ خلافت عجیب قسم کی تھی کہ نہ تو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور نہ اجماع ہوا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ دن کے بعد پھر متوکل کو بحیثیت خلیفہ قاہرہ میں بلالیا گیا۔

آٹھواں خلیفہ مستعین باللہ چونکہ بڑا عالی حوصلہ، خوددار اور صاحب ہمت بلند تھا۔ اس لئے اس نے جرأت سے کام لیکر قدم آگے بڑھایا اور سلطانِ مصر ناصر زین الدین بن برقوق کو گرفتار کرا کے قتل کرادیا جس کی وجہ سے سلطنت مصر کا تخت بھی اب اسی کے قبضہ میں آگیا۔ جو مسلمان خلافت کی بے دست وپائی پر دل ہی دل میں گھٹتے اور افسوس کرتے تھے ان کو اب طبعی طور پر خوشی ہونی چاہیے تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خوشی کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکی۔ ایک امیر شیخ محمودی نے اتنا اقتدار حاصل کرلیا کہ مستعین کو خلافت اور سلطنت دونوں سے معزول کر کے ایک قلعہ میں نظر بند کردیا۔ اور اس کے بھائی داؤد بن متوکل کو خلیفہ بنا کر خود سلطان مصر بن بیٹھا۔

مستعین باللہ کے بعد بھی بعض خلفاء نے سلطنتِ مصر پر قبضہ کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے یہ سلسلہ اسی طرح یوں ہی چلتا رہا یہاں تک کہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم اول نے مصر کو فتح کیا اور سلطنت کے ساتھ ساتھ خلافت کا بھی خاتمہ کردیا اور خود خلیفہ بن گیا۔ اس دن سے خلافت بنو عباس کے قبضہ سے نکلکر آل عثمان کے پاس چلی آئی۔

بغداد اور مصر کی خلافت عباسیہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے

کہ اسلام چونکہ خدا کا آخری دین ہے اور اس کو قیامت تک دنیا میں رہنا ہے اس بنا پر جب کبھی اس میں کسی ایک طرف سے ضعف اور اضمحلال پیدا ہوا تو جلد یا بدیر کسی اور جہت سے اس کی تلافی ہو گئی۔ چنانچہ جب خلافت بیجان ہو گئی اور وہ اسلام کی سیاسی مرکزیت کو سنبھالنے کے قابل نہ رہی تو خدا نے اس کی اس کمزوری کا تدارک کرنے کے لئے اسی خلافت کے "سایۂ عاطفت" میں چند اور دوسری حکومتیں اور سلطنتیں پیدا کر دیں جنھوں نے اس فرض کو باحسن وجوہ انجام دیا جو در حقیقت اولاً خلافت پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ افریقہ کے اغالبہ نے جس کا ہیرو زیادۃ اللہ اغلبی ہے بحر روم کے مشہور اور اہم جزیرہ سائپرس کو فتح کیا۔ سلجوقیوں نے ایشیاء کوچک کی عیسائی حکومت کو شکست دیکر اس پر قبضہ جما لیا۔ ایوبی خاندان کے بہادروں نے صلیبیوں کو بیت المقدس اور شام وغیرہ سے بے دخل کیا۔ غزنویوں اور غوریوں نے ہندوستانی ممالک پر تسلط حاصل کیا۔ پھر جب خلافت مصر میں چلی گئی تو ممالیک بحریہ نے تاتاریوں کے فتنۂ جہان آشوب کو فنا کرنے میں غیر معمولی ہمت و حوصلہ اور عزم و جسارت کا ثبوت دیا۔ اور تقریباً ڈھائی سو سال تک مرکز اسلام کے مغربی دروازہ کی پاسبانی کرتے رہے۔

آلِ عثمان

جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے سلطان سلیم اول نے ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا اور وہاں سے خلافت اور سلطنت دونوں کا خاتمہ کرکے خلافت کو آلِ عثمان کی طرف منتقل کر لیا۔ آلِ عثمان کی حکومت کی بنیاد ۶۹۹ھ میں پڑی تھی جبکہ ارطغرل نامی ایک ترکستانی امیر کے بڑے بیٹے عثمان خان اول نے دولتِ سلجوقیہ کے دار السلطنت قونیہ میں آخری سلجوقی تاجدار علاء الدین ثانی کے مارے جانے کے بعد افسر شاہی سر پر رکھا۔ اس طرح گویا دولتِ سلجوقی کے کھنڈروں پر آلِ عثمان کی سلطنت کا قصر رفیع الشان تعمیر ہوا۔ ابتداءً یہ

سلطنت ایک چھوٹی سی ریاست تھی اوراس کے اطراف وجوانب میں تیرہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو جوایشیاءِ کوچک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

عثمان خان اول کا کیرکٹر | عثمان خان اول نہایت شجاع، عالی حوصلہ، نیک عمل اور اسلام کا سچا شیدائی تھا اس نے تخت سلطنت پر متمکن ہوتے ہی ایشیاءِ کوچک کے رومی امراء کو کہلا بھیجا کہ اسلام قبول کرو، ورنہ جزیہ دو اور اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، اس کے جواب میں بعض امراء تو واقعی مسلمان ہو گئے۔ بعضوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اکثر ایسے تھے جو جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ عثمان خان نے اپنے بیٹے اورخان کی قیادت میں ایک لشکر جرار ان امراء سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا۔ دشمنوں کو تاتاریوں سے بڑی امداد پہنچی تھی مگر اس کے باوجود ان لوگوں کو پے بہ پے شکستیں ہوئیں، لیکن عثمان خان اول کے کارناموں میں یہ فتوحات ضمنی حیثیت رکھتی ہیں اس کی توجہ کا اصل مرکز بازنطینی سلطنت تھی جس سے کامل دس بارہ سال تک وہ جنگ وپیکار میں مصروف رہا اور آخر کار اس نے بازنطینی سلطنت کے اہم قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ بحرِ اسود کے ساحل تک پھیلا دیا اور شہر نیس پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔

۷۱۷ھ میں شہر بروصہ کا محاصرہ کیا جو ایشیاءِ کوچک میں سلطنت بازنطینی کا نہایت اہم شہر تھا، یہ محاصرہ دس سال تک جاری رہا۔ بالآخر ۷۲۷ھ میں اہلِ قلعہ قیصرِ روم کے حکم سے ایک رات موقع پا کر نکل بھاگے اور ترکی فوج شہر میں داخل ہو گئی، لیکن افسوس ہے کہ عثمان خان نے اس فتح کا مژدۂ جاں فزا بسترِ مرگ پر سنا، اورخاں جب یہ خوشخبری لیکر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو باپ نے بیٹے کی ہمت وشجاعت کی داد دیکر اس کو اپنا قائم مقام بنایا اور وصیت کی کہ "ظاہر وباطن ایک رکھنا۔ ہر کام میں خوفِ خدا اور مرضیٔ مولا کا لحاظ رکھنا، لوگوں پر رحم کرنا۔ ادائے حقوق کے معاملہ میں زور آور اور کمزور وناتواں دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھنا۔ کتاب وسنت کو اپنا دستور العمل بنائے رکھنا۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں جد وجہد کرنا۔ اور

احکام شریعت سے کبھی سرتابی نہ کرنا۔ اس کے بعد ہدایت کی کہ مجھکو بروصہ میں ہی دفن کیا جائے۔ چنانچہ وصیت کے مطابق انتقال کے بعد بروصہ میں ہی دفن کیا گیا اور ایک شاندار مقبرہ اس پر تعمیر ہوا۔

آلِ عثمان کی حکومت ۶۹۶ھ سے ۱۳۴۲ھ تک جبکہ اس خاندان کے آخری فرمانروا سلطان عبدالمجید ثانی کو معزول کرکے خلافت کا خاتمہ کردیا گیا چھ سو تینتالیس[۶۴۳] سال رہی۔ اس طویل مدت میں ۳۷ فرماں روا ہوئے جن میں سے سلطان بایزید ثانی (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ) تک آٹھ فرمانروا سلاطین کہلائے پھر سلطان سلیم اول نے اپنی خلافت کا اعلان کردیا تو اب یہ خود اور اس کے بعد کے تمام فرمانروایان عثمانی خلیفہ کہلانے لگے۔

مسلسل فتوحات اور اسلام کا یورپ میں داخلہ

عثمان خان کی وفات کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ اس نے بازنطینی حکومت کو ختم کرکے اسلام کو یورپ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل کرنے کی جو مہم شروع کی تھی اس کے لائق جانشینوں نے اس کے بعد بھی اس کو برابر کامیابی کے ساتھ جاری رکھا اور آخرکار انھیں اپنے مقاصد میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ عثمان خان کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا اورخان تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے اندرونی انتظامات و اصلاحات کے علاوہ اپنی توجہ یورپ کی طرف بھی مرکوز رکھی۔ اس بنا پر موقع پاتے ہی اس نے گیلی پولی پر قبضہ کرلیا جو دردانیال کے ساحل پر ایک بڑا اہم قلعہ تھا۔ فتح سے قبل ایک سخت زلزلہ کے باعث گیلی پولی کی شہر پناہ بالکل تباہ ہوچکی تھی۔ اورخان نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کے ذریعہ اس کو درست کرایا اور پھر یہاں ترکی فوج کا ایک زبردست دستہ متعین کردیا۔ پھر تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کرلئے اور عربوں اور ترکوں کی کثیر آبادی کو ان مقبوضات میں لاکر آباد کردیا۔

"دولتِ عثمانیہ" کے فاضل مصنف محمد عزیز صاحب ایم۔ اے کے بقول "گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۷۵۵ھ مطابق ۱۳۵۴ء میں انھوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے

یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے دیانا کی دیواروں تک پھیل گئی۔ قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے دینِ حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ ور کیا تھا اور اپنے علوم کی روشنی اس کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی۔ لیکن مشرقی یورپ پر ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرزمین ایک مشعل ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت عثمانیوں کے ہاتھوں کے لئے مقدر ہو چکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی، ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا۔" سلہ

اورخان نے اپنی فتوحات اور ملکی وفوجی انتظامات کے باعث بازنطینی حکومت کو اس درجہ مرعوب کر دیا تھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت جو حضرت معاویہؓ کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں کی حریف رہی تھی اب اس کے قیصر کنٹا کوزین نے دولت عثمانیہ کے ساتھ اپنی دوستی مضبوط کرنے کی غرض سے اپنی نوجوان بیٹی تھیوڈورا کو اورخان کے حبالۂ عقد میں دینے کی پیش کش کی۔ اورخان نے اس کو منظور کر لیا اور شہزادی کو اپنے دینِ مسیحیت پر ہی قائم رہنے کی اجازت دی۔

اورخاں غیر معمولی اولعزم بہادر اور حوصلہ مند ہونے کے علاوہ یوں بھی نہایت مدبر نیک اور شریعت کا پابند تھا اس نے رفاہِ عام کے کاموں کے سلسلہ میں جو مساجد، مدارس، خانقاہیں، پل، لنگرخانے رباط اور حمام وغیرہ بنوائے ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے ۷۶۱ھ میں جبکہ اس کی عمر ۸۲ سال کی تھی وفات پائی۔

سلطان مراد اول اورخاں کا بڑا لڑکا سلیمان پاشا شکار میں گھوڑے سے گر کر باپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان مراد اول تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ اور دادا کی روایات کو باقی رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی چنانچہ اس نے اردگرد کے امراء کو

سلہ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۳۶ و ۳۷

جھوں نے انگورہ کے امیر علاء الدین کے اکسانے پر آلِ عثمان کی طاقت کو کمزور کرنے کی غرض سے یورش کی تھی شکستِ فاش دی اور انگورہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جزیرہ نمائے بلقان کی طرف توجہ کی اور اور نہ کو فتح کر کے اس کو اپنا دار السلطنت بنا لیا۔

اس وقت اگرچہ سلطنت بازنطینی اور دوسری مسیحی حکومتیں باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھیں مگر اب سلطان مراد کی فتوحات اور اس کے فوجی و ملکی استحکامات کو دیکھ کر ان سب کو خطرہ پیدا ہوا اور یہ سب طاقتیں پوپ کی دعوت پر جمع ہوگئیں اور صلیب و مسیحیت کے نام پر انھوں نے سلطان مراد سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مراد اس وقت شہر بیجا کا محاصرہ کئے ہوئے ایشیائے کوچک میں پڑا تھا۔ اتحادیوں کے ان منصوبوں کی اطلاع پاتے ہی وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا لیکن اس کے پہنچنے سے قبل ہی اس کا بہادر جرنیل لالہ شاہین دریائے مرتضیٰ کے کنارہ پر پہنچ کر اتحادی افواج پر جبکہ وہ شراب و کباب کی سرمستیوں میں سرشار تھیں ایک ایسا کامیاب شبخون مار چکا تھا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ جان بچا کر نکل بھاگے تھے۔

۸۰ء میں شاہ سرویا، فرمانروائے بلغاریہ کو اپنے ساتھ متحد کر کے پھر سلطان مراد کی طاقت توڑنے کے لئے آیا۔ لیکن دونوں کو جلد ہی اپنی کمزوری کا یقین ہو گیا اور انھوں نے خراج کے طور پر سالانہ ایک بڑی رقم دینے کی شرط پر صلح کر لی۔ شاہ بلغاریہ نے مزید یہ کیا کہ اپنی بہن بھی سلطان کے نکاح میں دیدی۔

۷۹۱ء میں اتحادیوں نے جن میں سرویا۔ بوسینا۔ بلغاریہ، البانیہ، ولاچیا اور ہنگری اور پولینڈ، یہ سب ریاستیں شامل تھیں، متحد و متفق ہو کر دو لاکھ فوج کے ساتھ ترکوں کو یورپ سے نکال باہر کرنے کے ارادہ سے اقدام کیا۔ مراد اس وقت بروصہ میں مقیم تھا اور بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ تاہم مقابلہ کے لئے فوراً روانہ ہو گیا صحرائے کسودا میں نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن اتحادیوں کو اس میں بھی شدید ناکامی ہوئی۔ شاہ سرویا لازار گرفتار ہو کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بار بار کی غداری کے جرم میں اس کو قتل کرا دیا۔

اس جنگ کے بعد تھریس، مقدونیا اور جنوبی بلغاریہ کے تمام علاقے دولتِ عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل ہوگئے۔ اور سرویا اور سینا باج گذار ریاستیں بن گئیں۔

ابھی جنگ کسووا ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک نابکار سروی نے دھوکہ سے سلطان مراد پر خنجر کا ایسا کاری زخم لگایا کہ سلطان چند روز کی تکلیف کے بعد انتقال کرگیا اور اسی پر جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

سلطان بایزید ایلدرم جنگ کسووا میں سلطان مراد اول کے بڑے بیٹے بایزید نے غیر معمولی شجاعت و دلیری کا اظہار کیا تھا اور اسی وجہ سے اس کو "ایلدرم" (بجلی) کہا جاتا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد میدان کسوڈا میں ہی باتفاق امراء وارکان سلطنت تخت نشین ہوا۔

سلطان بایزید ایلدرم نے تخت نشین ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی یعقوب پاشا کو جس نے جنگِ کسووا میں غیر معمولی دلیری اور جاں بازی کا ثبوت دیا تھا محض اس گمان پر قتل کرادیا کہ شہزادہ کو تختِ سلطانی حاصل کرنے کی آرزو ہے اور اس بنا پر اس کی طرف سے حکومت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آلِ عثمان میں بڑے بھائی کے ہاتھ سے محض تختِ سلطنت کی خاطر چھوٹے بھائی کا یہ پہلا قتل تھا جو ان کی پیشانی پر بدنامی کا داغ بن کر چمکا۔

اس ایک داغِ رسوائی سے قطع نظر سلطان بایزید ایلدرم نے فتوحات کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بے شبہ اسلام کی تاریخ فتوحات کا ایک روشن باب ہیں۔ اس نے سرویا کے مقتول بادشاہ کے بعد اس کے بیٹے کو جانشین کیا اور خراج کی رقم سالیانہ کے علاوہ شرط کی کہ شاہ سرویا پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ ہر وقت سلطان کی خدمت کے لئے وقف رکھیگا۔ شاہِ سرویا نے اس شرط کو بھی منظور کرلیا اور مزید اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا سلطان کے نکاح میں دیدی۔

سرویا سے اس طرح تعلق استوار کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور آخر کار قیصر روم کو مجبور کیا کہ وہ ایک اور جدید عہدنامہ پر دستخط کرے جس سے قیصر کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں مل گئی

ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کا صرف ایک مقبوضہ قلعہ فلاڈلفیا رہ گیا تھا اس معاہدہ کی رو سے وہ بھی بایزید کے قبضہ میں آگیا۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ انتہائی حیرت سے سنا جائیگا کہ قلعہ فلاڈلفیا معاہدہ کے رو سے بایزید کا ہو چکا تھا لیکن قلعہ کے یونانی افسر نے قیصر کا حکم ماننے اور بایزید کا اس پر قبضہ کرانے سے انکار کر دیا۔ بایزید نے قیصر سے کہا کہ تم خود اپنی فوج بھیجکر قلعہ فتح کرو اور پھر اسے ہمارے قبضہ میں دیدو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا قیصر روم نے اسے پہلے فتح کیا اور پھر اسے بایزید کے حوالے کر دیا۔ ظاہر ہے دولت عثمانیہ کے سامنے بازنطینی حکومت کی بے بسی اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی تھی؟

پھر بایزید نے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خاص قسطنطنیہ کی نسبت قیصر روم سے عہد لیا کہ قسطنطنیہ کا ایک محلہ مسلمانوں کی آبادی کے لئے مخصوص کر دیا جائیگا۔ ان کو شہر میں ایک جامع مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان کے معاملات وخصومات کا فیصلہ کرنے کے لئے ان کا ایک قاضی بھی الگ ہی ہوگا اس کے علاوہ شہر سے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے ان کا دسواں حصہ (عشر) بھی عثمانی خزانہ میں داخل ہوتا تھا۔ کہتے ہیں اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔[1]

فتوحات اب تک بایزید نے بغیر لڑے ہی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اب میدانِ جنگ میں بھی اپنی شمشیر خاراشگاف کے جوہر دکھانے کا موقع آگیا۔ سرویا اور قسطنطنیہ سے معاہدے کر لینے کے بعد بایزید نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے بھی اپنا باج گذار بنا لیا۔ اسی اثناء میں ہنگری کے بادشاہ سجسمنڈ نے بایزید پر حملہ کرنے کے لئے بہت فوجیں جمع کر رکھی تھیں۔ ولاچیا سے فارغ ہو کر بایزید نے ہنگری کا رخ کیا۔ بوسینیا کی فوجیں بھی ہنگری کی افواج کے دوش بدوش تھیں۔ گھمسان کا رن پڑا اور انجام کار شاہِ ہنگری کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔

---

[1] ہربرٹ گبنس بحوالہ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۵۷۔

۷۹۵ھ میں بایزید نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریا کی طرف روانہ کیا جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے اس کا جنوبی حصہ سلطان مراد کے زمانہ میں ہی دولت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا۔ شمالی حصہ رہ گیا تھا۔ شاہ بلغاریا نے جمکر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتوں کے محاصرہ کے بعد دارالسلطنت کا سقوط ہوگیا اور اب پورا ملک عثمانی مقبوضات میں داخل ہوگیا۔ بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہوگیا اور اسقف اعظم جلاوطن کردیا گیا۔ یہاں کے جن لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کی زمینیں انھیں کے قبضہ میں رہنے دی گئیں۔ باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں میں تقسیم کردیا گیا۔

صلیبی اتحاد بلغاریا کے فتح ہو جانے سے ترکوں کے لئے ہنگری کا راستہ کھل گیا تھا۔ اس لئے اب شاہ ہنگری سجسمنڈ کو شدید خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے یورپ کے بادشاہوں کو اُکسایا۔ ہنگری کلیسائے روما سے وابستہ تھا اس لئے پوپ نے بھی اس کی تائید کی اور ترکوں کے خلاف ایک فیصلہ کن صلیبی جنگ لڑنے کا اعلان کردیا۔ سلطان مراد کے عہد میں مشرقی یورپ کی تمام سلطنتیں متحد ہوگئی تھیں لیکن مغربی یورپ کی ریاستوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس مرتبہ یہ ہوا کہ چونکہ کلیسائے یونان و روما دونوں متفق تھے اور ادھر فرانس اور انگلینڈ میں بھی صلح ہو چکی تھی اس لئے ترکوں کے خلاف اس صلیبی محاذ میں مشرقی اور مغربی یورپ دونوں کی سلطنتیں متحد ہوگئیں۔ ان صلیبی اتحادیوں کے منصوبے یہ تھے کہ ترکوں کو ہنگری کی سرحدوں سے نکالنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر دردانیال کو عبور کرتے ہوئے شام میں گھس کر ارض مقدس پر قبضہ کرلیں اور اس طرح سلطان صلاح الدین اور سلطان رکن الدین بیبرس کا انتقام لیں۔

ان منصوبوں کے ساتھ یہ اتحادی فوجیں جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ بودا واقع ہنگری میں جمع ہوئیں اور وہاں سے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھیں۔ سرویا کا بادشاہ بایزید کا باجگذار تھا ہی، وہ اب بھی دولت عثمانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری پر قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلیبی مجاہدوں نے اس غریب کے ملک میں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم کردیا۔ پھر آگے بڑھکر متعدد قلعے فتح کرتے ہوئے

سجسمنڈ کی فوج نانکوپولس کی طرف بڑھیں اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ ہر چند کہ محاصرہ بہت سخت تھا لیکن یہاں کے بہادر رئیس یوعلان بک نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ سلطان بایزید اس شہر سے دست بردار نہیں ہو سکتا وہ ضرور اس کی مدد کو پہنچیگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

بایزید کو اس محاصرہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنی منتخب فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا اور محاصرہ کے سولھویں دن نانکوپولس پہنچکر دشمن فوجوں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔

۲۳ ذیقعدہ ۷۹۸ھ کو مقابلہ ہوا جس میں اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کے ہزاروں سپاہیوں کے خون سے میدانِ جنگ لالہ زار بن گیا۔ دس ہزار کے قریب فوجی گرفتار ہوئے۔ شاہِ ہنگری چند ہزاروں کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا۔ اس جنگ میں بایزید کو سرویا کی فوج سے بڑی مدد ملی جو بایزید کی مدد کے لئے بڑی ہمت و پامردی سے لڑی تھی۔

اس عظیم الشان فتح کی نوید جاں فزا اسلامی ممالک میں پہنچی تو ہر جگہ اس پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور مصر کے خلیفۂ عباسی متوکل علی اللہ نے بھی اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار اس طرح کیا کہ بایزید کے نام تمام مفتوحہ علاقوں کا فرمان بھیجا۔ اس کے بعد بایزید نے آسٹریا اور ولاچیا جس نے مذکورہ بالا جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو کر دولتِ عثمانیہ سے غداری کی تھی اور ہنگری ان سب پر حملہ کرنے کے لئے فوج بھیجی جس نے ان ملکوں کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا مگر خود یونان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور بڑی آسانی سے تھسلی۔ فوسیس۔ ڈوریس اور لوکریس پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے دو سپہ سالاروں نے جن کا نام یعقوب اور افرینوس تھا خاکنائے کورنتھ کو طے کر کے جنوب کا رخ کیا اور تمام موریا کو فتح کر لیا۔ موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیئے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کی نوآبادیاں قائم کر دی گئیں۔

یونان کی مہم سے فارغ ہوتے ہی بایزید کو خبر ملی کہ قیصر روم نے ان مسلمانوں کے ساتھ جو قسطنطنیہ

میں آباد تھے ان پر سختیاں شروع کردی ہیں۔ اس خبر کو سنکر بایزید نے قیصر سے مطالبہ کیا کہ وہ تخت سے دست بردار ہوجائے۔ لیکن اس نے مسیحی حکومتوں کی امداد کی توقع پر ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا۔

جنگِ انگورہ | لیکن اب یکایک حالات میں انقلاب پیدا ہوا یعنی بایزید ایلدرم اور تیمور لنگ میں زبردست معرکہ ہوا جس نے دولتِ عثمانیہ کی قسمت ہی پلٹ کر رکھدی۔ تاریخ اسلام کے اس اہم ترین معرکہ کا اثر اسلام اور مسلمانوں پر کیا ہوا؟ اس سلسلہ میں ہم ہندوستان کے مشہور مورخ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے ایک قابل قدر مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو بارہ تیرہ سال ہوئے انقلاب لاہور کے سالگرہ عید نمبر میں شائع ہوا تھا۔

"۸۰۰ھ میں جب تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو یہاں تغلقوں کی حکومت جانکنی کی حالت میں تھی مگر اسلام اور اسلامی عظمت و اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اسپین کی اسلامی حکومت کو جس کا دارالحکومت غرناطہ تھا عیسائی بالکل مٹادینے پر آمادہ ہوچکے تھے لیکن کسوڈا کی جنگِ عظیم اور بایزید ایلدرم کی پرہیبت معرکہ آرائیوں کے خوف سے یورپ کے عیسائی کچھ سہم سے گئے تھے اور ان کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں مسلمانوں کا وجود تقریباً ڈیڑھ سو برس تک کے لئے اور باقی رہ گیا۔ تیمور ہندوستان میں مشرق کی جانب ہردوار تک آیا۔ دہلی، ملتان اور دامن کوہِ کشمیر میں قتلِ عام سے خون کے دریا بہا کر اور ہندوستان کا ملک یہاں کے باہمت و ذی حوصلہ مسلمان سرداروں کیلئے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

تیمور ہردوار میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ بایزید ایلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہورہی ہیں اس خبر کے ساتھ ہی قیصرِ روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی مع خط پہنچا کہ "بایزید کے پاس آپ کے مفرور مجرم سلطان احمد اور قرا یوسف ترکمان راحت و آرام اور عزت و احترام

کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں آپ کی بڑی بے عزتی ہے، بایزید نے ہماری قدیم سلطنتوں اور عزتوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے حالانکہ ہارون رشید اور معتصم باللہ عباسی خلفا نے بھی ہماری سلطنت کو مٹانا نہیں چاہا اور مسلمانوں نے ہمیشہ ہماری سلطنت وحکومت کو عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ نیز بایزید نے اپنی فوجیں داغستان میں بھی جمع کی ہیں وہ بہت جلد آذربائیجان وغیرہ پر قبضہ کیا چاہتا ہے۔ آپ اس طرف آئیں، اپنی سرحدوں کو بچائیں اور ہم کو بھی اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ تیمور سے توقع تھی کہ وہ قیصر کی اس درخواست کا ایسا مایوس کن اور مسکت جواب دیتا جیسا کہ ساڑھے سات سو برس پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے قیصر روم کو خط لکھا تھا کہ اگر تیرے مقابلہ کے لئے حضرت علیؓ کے لشکر کو حرکت کرنی پڑی تو سب سے پہلا سردار جو حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے تجھ پر حملہ آور ہوگا وہ معاویہ ہوگا لیکن تیمور جذبۂ رقابت پر غالب نہ آسکا۔ نیز سلطان احمد جلائرا اور قرا یوسف ترکمان کے بایزید کی پناہ میں چلے جانے کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ ہندوستان سے فوراً چل دیا۔ راستہ میں ایک لاکھ ہندوستانی قیدیوں کو جو بار خاطر یا گراں باریِ سفر کا موجب تھے بجائے اس کے کہ آزاد کر دیتا قتل کر ڈالا ہندوستان سے افغانستان ہوتا ہوا سمرقند پہنچا۔ وہاں سے تیاری کرکے ایران ہوتا ہوا اپنے ملک کی مغربی اور بایزیدی قلمرو کی مشرقی سرحد پر پہنچکر بایزید کو جو قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک تہدیدی خط لکھا کہ ہمارے مفرور مجرموں کو فوراً ہمارے پاس بھیجدو۔ بایزید نے پناہ گزینوں کے دینے سے صاف انکار کیا۔

اس باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۰۳ھ میں تیمور نے آرمینا کی طرف سے بایزیدی علاقوں میں داخل ہوکر سیواس کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں بایزید کا بڑا لڑکا ارطغرل صوبہ دار تھا اس نے سخت مقاومت کی لیکن آخر مارا گیا اور سیواس فتح ہوگیا۔ تیمور نے اس جنگ کے چار ہزار ترک قیدیوں کے ساتھ یہ انسانیت سوز برتاؤ کیا کہ انھیں زندہ دفن کرادیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں یہ سنگدلی اور وحشت وبربریت کا ایک ایسا ہولناک مظاہرہ تھا جس کی نظیر خود تاتاریوں کے مظالم میں بھی نہیں مل سکتی۔

یہ اطلاع ملتے ہی بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج لیکر تیمور کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ تیمور اب سیواس کے میدان کو اپنے لئے تنگ پاکر انگورہ آچکا تھا۔ اسی مقام پر دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں تیمور کی فوج تعداد میں سات آٹھ لاکھ تھی یعنی بایزید کی فوج سے سات گنی زیادہ۔ پھر بھی بایزید نے نہایت بے جگری اور اپنی شہرۂ آفاق بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن تعداد میں بہت کم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشکل یہ پیش آگئی کہ بایزید کی فوج کے بعض تاتاری دستے غداری کرکے تیمور سے جاملے۔ اس بنا پر بایزید کو اس جنگ میں شکست فاش ہوئی اور وہ اپنے بیٹے موسیٰ کے ساتھ گرفتار ہوگیا۔ آٹھ مہینے تیمور کی اسارت میں رہنے کے بعد اس کو قید ہستی و زندانِ آہنی دونوں سے بیک وقت رہائی ملی۔

تیمور نے بایزید کو شکست دیکر اسے گرفتار کرلینے اور اس طرح اپنی آتشِ انتقام و جذبہ رقابت کو بجھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں آزاد کرکے اور ان کی حکومتوں کو دوبارہ بحال کرکے ایشیائے کوچک سے دولتِ عثمانیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہی کردیا۔ آہ افسوس!

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے　　اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جنگِ انگورہ کا اسلام پر اثر

دولتِ عثمانیہ پر اس اثر کے باعث خود اسلام کے عروج و ترقی اور یورپ میں اس کی پیشقدمیوں کو جو صدمۂ عظیم پہنچا۔ شاید موجودہ حالات میں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں۔

"بایزید کے مغلوب و اسیر ہونے سے یورپ میں اسلام کے روز افزوں اقتدار و ترقی کو سخت نقصان پہنچا لیکن اگر تیمور شکست پاکر اسیر یا مقتول ہوجاتا تو صرف خاندانِ تیموری کو نقصان پہنچتا مگر اسلام کو براعظم ایشیا میں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لڑائی میں بایزید کی حد سے بڑھی ہوئی بہادری اور کسی قدر ناعاقبت اندیشی کو ضرور ملزم ٹھہرایا جاسکتا ہے اس کے سوا اس عثمانی سلطان پر اور کوئی

الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ جنگِ انگورہ نے تمام یورپ کو مسلمانوں کا محکوم و مغلوب ہونے سے بچا لیا
انگورہ کا معرکہ اگر برپا نہ ہوا ہوتا تو جاپان سے انگلستان تک تمام دنیا ایک مرتبہ پرچم اسلام کے
سایہ میں آ چکی ہوتی"۔

سلطنتِ عثمانیہ کی نشأۃ ثانیہ

تیمور لنگ کا حملہ اور اس کی کامیابی دولتِ عثمانیہ کے جسم پر ایسا زخم کاری تھا کہ بہ ظاہر اس کے مندمل ہونے کی توقع نہیں تھی۔ ایشیائے کوچک میں عثمانی سلطنت کی زبوں حالی دیکھکر یورپین مقبوضات میں بھی اس کے خلاف بغاوت کے شرارے بھڑکنے لگے۔ لیکن ابھی قدرت کو اس حکومت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے عظیم الشان کام لینے تھے۔ اس لئے اس کے تنِ مردہ میں پھر جان پڑ گئی اور اس نے جلد ہی دس گیارہ سال کے اندر اندر اپنی قوت و عظمتِ رفتہ واپس لے لی۔

سلطان بایزید ایلدرم کے پانچ لڑکے تھے جن میں سے ایک ارطغرل جنگ سیواس میں مارا گیا تھا باقی چار لڑکوں نے باپ کی وفات کے بعد مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ محمد ان سب میں چھوٹا اور سب سے زیادہ عقلمند، مدبر اور بہادر تھا۔ آخر میں وہ سب پر غالب آیا۔ اور ۸۱۶ھ میں تن تنہا سلطنتِ عثمانیہ کا مالک ہو گیا۔ بحیثیت سلطان اس کی مدتِ حکومت صرف آٹھ سال (از ۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ) ہے اور اس تمام مدت میں وہ اگرچہ اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح کوئی قابلِ ذکر فتح حاصل نہیں کر سکا لیکن اس کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ اس نے دولتِ عثمانیہ کے جسمِ ناتواں میں پھر از سرِ نو ایک روح تازہ پیدا کر دی اور ایشیا، اور یورپ میں اس کا اقتدار اتنا ہی مضبوط کر دیا جتنا کہ تیمور کے حملہ سے پہلے تھا۔

ذاتی اوصاف کے لحاظ سے بھی محمد نہایت رحمدل، عادل اور حلیم و بردبار تھا ۸۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

سلطان مراد ثانی

سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد ثانی تخت نشین ہوا۔ دولتِ عثمانیہ کا دوبارہ استحکام محمد اول کے عہد میں ہی ہو چکا تھا۔ ایشیائے کوچک کے بعض امراء جواب بھی سرکشی سے

باز نہیں آئے تھے سلطان مراد ثانی نے پہلے ان کو مطیع اور اپنا وفادار بنا لیا۔ پھر وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا شاہِ ہنگری نے خائف ہو کر دریائے ڈینیوب کے تمام شمالی علاقے سلطان کے حوالہ کر دیئے۔ سالونیکا جو بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا اور جو گذشتہ سو سال کی مدت میں تین مرتبہ ترکوں کے قبضہ میں آیا اور پھر ان کے ہاتھ سے نکلکر یونانیوں کے قبضہ میں جاچکا تھا۔ اسے فتح کیا۔ سرویا کو پھر ترکی حکومت کا مطیع و وفادار بنایا۔ قسطنطنیہ کا بھی محاصرہ کیا۔ لیکن اس شہر کو فتح کرنے کے لئے قدرت کسی اور کے دست و بازو کو ہی برروئے کار لانیوالی تھی۔

سلطان مراد ثانی سلطنت کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھکر زندگی کا حقیقی سکون و اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ اپنے لڑکے محمد کے حق میں دست بردار ہو کر سلطنت و حکومت سے کنارہ کش ہو گیا۔ صلیبی اتحادیوں نے یہ سمجھکر کہ محمد نوعمر ہے اور ناتجربہ کار پھر ایک مرتبہ متفق و متحد ہو کر دولتِ عثمانیہ کے اقتدار کو یورپ سے ختم کر دینے کی جدوجہد شروع کی۔ یہ دیکھکر سلطان مراد ثانی کو گوشۂ عزلت سے نکلکر میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔ کسووا کے میدان میں ہی ان افواج کا اجتماع ہوا لیکن اتحادیوں کو جن میں ہنگری، جرمنی، پولینڈ، بوسنیا اور رولاچیا سب شریک تھے شکستِ فاش ہوئی اور وہ مایوس و ناکام ہو کر واپس چلے آئے۔

ان طاقتوں کو سب سے بڑا ناز ہنگری فوج کے ایک سپہ سالار ہونیاڈے پر تھا جس نے اپنی شجاعت کا جوہر دکھا کر مغربی یورپ میں اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ یہ سپہ سالار تقریباً بیس سال تک ترکوں سے جنگ کرتا رہا اور کئی مرتبہ اس کو فتوحات بھی حاصل ہوئیں جن سے اس کا اور اتحادیوں کا حوصلہ دوچند ہو گیا لیکن آخر کار جنگ وارنا میں اس کو ترکوں کے ہاتھ سے زبردست شکست ہوئی۔ جس میں عیسائیوں کے متعدد بادشاہ اور امراء و اعیان بھی کام آئے ۵ محرم الحرام ۸۵۵ھ کو وفات پائی۔

سلطان محمد فاتح اور فتح قسطنطنیہ

سلطان مراد ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔ اس کے آبا و اجداد قسطنطنیہ کے اطراف و اکناف میں جو بلاد و امصار تھے ان کو فتح کر کے بازنطینی سلطنت کے اس اہم دارالسلطنت کو تسخیر کر لینے کی راہ کھول ہی چکے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے تاریخ اسلام کی اس شاندار مہم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں اس نے باسفورس کے یورپی ساحل پر ایک حصار تعمیر کرایا جو قسطنطنیہ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ پھر محاصرہ کا کل سامان بنوایا۔ ہنگری کے ایک صناع سے بڑی توپیں بنوائیں جن کے کھینچنے کے لئے ساٹھ ساٹھ جوڑ بیل لگتے تھے جب یہ سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ادرنہ سے خود نوے ہزار فوج لیکر روانہ ہوا۔ اور دوسری جانب ایک امیر کی قیادت میں جنگی کشتیاں روانہ کیں اور اس طرح بری اور بحری دونوں جانبوں سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کا دن حملہ کے لئے مقرر تھا۔ اس رات تمام لشکر دعا اور عبادت میں مشغول رہا ہر طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں آتی تھیں۔ دن نکلتے ہی نماز فجر ادا کرنے کے بعد مسلمان فصیل کی طرف بڑھے۔ رومیوں نے نہایت ہمت و پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ قیصر روم قسطنطین اسی جنگ میں مارا گیا۔ دوپہر تک جنگ ہوتی رہی اور رومی اسلامی فوج کے پے بہ پے حملوں کے سامنے ایک ناقابل جنبش دیوار استقامت بنے کھڑے رہے لیکن ادھر محمد بھی عزم و ثبات کا پیکر تھا اس نے جدید توپوں سے فصیل پر گولہ باری کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور پھر آخر میں خود اپنی فوج کا ایک خاص دستہ لیکر آگے بڑھا رومی اس وقت لڑتے لڑتے بالکل خستہ ہو چکے تھے ان میں اس جدید حملہ کی تاب نہ تھی اور ادھر مسلسل اور بے پناہ گولہ باری سے فصیل کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دیوار ٹوٹی اور سپاہیوں کا ایک دستہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اور دوسرے دستے بھی شہر میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو گئے اور اس طرح آج اسلام کی ایک دیرینہ تمنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی دولت عثمانیہ کے ساتویں فرمانروا کی کوششوں سے پوری ہوئی۔ سقوط قسطنطنیہ کا یہ واقعہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء

میں پیش آیا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح بھی اپنے وزراء و اعیان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ مشہور گرجا ایا صوفیا کے دروازہ پر پہنچکر اذان دلوائی اور ظہر کی نماز پڑھی جس کے بعد یہ کنیسہ جامع مسجد میں تبدیل ہوگیا

اس فتح عظیم کی خوشی میں تمام عالم اسلام میں جگہ جگہ مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا اور ہر طرف سے ملوک و سلاطین اور علماء و شعراء نے سلطان کو پیغامہائے تہنیت ارسال کئے "بلدۂ طیبہ" قرآن مجید کی ایک آیت کا ٹکڑہ ہے وہ اس فتح کی تاریخ ہے۔ اس دن سے سلطان کا لقب فاتح پڑا۔ سلطان نے اب اسی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہ پہلا دن تھا کہ جو شہر ایک ہزار برس تک روم کا پایۂ تخت بنا رہا اب اسے ایک اسلامی حکومت کے پایۂ تخت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ فتح کے تین دن بعد ہی حضرت ابو ایوب انصاری کی قبر کا پتہ چلا تو سلطان نے اس پر ایک جامع مسجد تعمیر کرادی جس میں سلاطین عثمانیہ کی رسم تاجپوشی ادا کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں غالباً یہ بات دلچسپی سے سُنی جائیگی کہ فتح قسطنطنیہ کے وقت سلطان کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی۔

دوسری فتوحات | قسطنطنیہ کی فتح کو مورخین نے تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی غیر معمولی اور اہم واقعہ تسلیم کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اب مشرقی رومن امپائر کا بالکل خاتمہ ہوگیا تھا جو خلفاءِ راشدین کے زمانہ سے اب تک ممالک اسلامیہ کے پہلو میں ایک کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے بعد بھی اپنی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ اس نے ۸۸۳ھ میں البانیا کے متعدد قلعے فتح کئے۔ پھر ہنگری پر فوج کشی کی۔ ۸۸۴ھ میں بحر روم کے متعدد جزائر کو فتح کیا۔ جزیرہ روڈس پر بھی چڑھائی کی مگر وہ اس وقت فتح نہ ہوسکا۔ ۴ار ربیع الاول ۸۸۶ھ کو سلطان نے وفات پائی۔ اس کا عہد فتوحات کے علاوہ انتظامات اور رفاہِ عام کے متعدد کاموں کی وجہ سے بھی سلاطینِ عثمانی میں ممتاز ہے۔

سلطان محمد فاتح کے بعد اس کا بیٹا بایزید ثانی تخت نشین ہوا۔ اور اگرچہ اس کا عہد فتوحات کے

اعتبار سے کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے تاہم یہی بساغنیمت ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی وراثت کو سنبھالے بیٹھا رہا۔ ۹۱۸ھ میں اس نے اپنے بیٹے سلیم کو سلطان بنا کر خود گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن ابھی سفر میں ہی تھا کہ انتقال کر گیا۔

سلطان سلیم اول اس کے بعد سلطان سلیم اول نے مستقلاً عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ سلطان سلیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تو ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کے منصوبوں کی اطلاع پا کر چڑھائی کی اور ۹۲۰ھ میں بمقام چالدیران شاہ اسماعیل صفوی کو شکست دیکر تبریز، ہمدان، آذربیجان اور قفقاز پر قابض ہو گیا۔ پھر یکایک بلادِ عرب کی طرف متوجہ ہوا اور دیار بکر کو فتح کرتا اور مملکت ذوالقدریہ کو جو مرعش اور بستان کے اطراف واکناف میں قائم تھی پامال کرتا ہوا شام پہنچا۔ ممالیک مصر کئی مرتبہ دولتِ عثمانیہ کے قلعوں پر حملے کر کے ان میں سے بعض پر قبضہ کر چکے تھے اور یوں بھی آئے دن ترکوں کو پریشان کرتے رہتے تھے اس لئے مرج دابق میں جو حلب کے مضافات میں سے ہے سلطان سلیم نے مصر کے چرکسی بادشاہ غوری سے معرکہ آرائی کی، نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن فتح عثمانی بادشاہ کو ہوئی۔ غوری گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ غوری کے بعد سلطان طومان بے مصر کا بادشاہ ہوا۔ اُدھر عثمانی فوجیں قاہرہ میں داخل ہو چکی تھیں۔ طومان بے نے شدید مقاومت کی۔ لیکن بیسود۔ اس جنگ میں گرفتار ہوا اور چند روز کے بعد سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اس دن سے مصر بھی عثمانی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

خلافت ۲۴ رجب ۹۲۴ھ کو قسطنطنیہ واپس پہنچا۔ مصر سے آخری عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جامع ایا صوفیہ میں داخل ہو کر خلیفہ نے خلافت کا منصب اور اس کے تبرکات یعنی تلوار۔ علم۔ اور ردائے نبوی سلطان سلیم کے حوالہ کی۔ اس دن سے خلافت بنو عباس سے منتقل ہو کر آلِ عثمان میں آگئی اور سلطان سلیم تمام عالم اسلام کا خلیفہ ہو گیا[1]۔ سلیم ابھی مصر میں ہی تھا کہ شریف مکہ کے بیٹے نے حاضر ہو کر

[1] عام طور پر مشہور تو یہی ہے کہ سلطان سلیم نے مصر کو فتح کرنے کے بعد خود خلافت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اپنے باپ کی طرف سے حرمین شریفین کی کنجیاں بھی سلیم کے سپرد کردیں۔ اس بنا پر آج سے ترک اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین بھی کہنے لگے۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کا خطبہ پڑھتے ہوئے خطیب نے سلیم کے لئے "مالک الحرمین الشریفین" کے الفاظ کہہ دیئے تو سلیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور خطیب سے بولا میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حرمین شریفین کا مالک ہوں۔ میرے لئے یہی فخر کچھ کم نہیں ہے کہ میں "خادم الحرمین الشریفین" کہلاؤں"۔ [1]

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲ ص ۴۹۱۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۳۶) لیکن محترمہ خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "کشمکش مشرق و مغرب ترکی میں" (Conflict of East and West in Turkey) کے صفحہ ۲۵ میں اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے بحث کی ہے ہم ذیل میں اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ محترمہ لکھتی ہیں۔

سلطان سلیم کی فتح (مصر) کی سب سے پہلی دستاویز وہ فتح نامہ ہے جو سلطان نے ۱۵۱۶ء میں اجنبی حکومتوں (ایران اور وینس) کے نام بھیجا تھا۔ اس فتح نامہ میں خلافت کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے حالانکہ اگر سلطان ایسے شخص کا مقصد خلیفہ بننا ہوتا تو وہ دنیا کو ضرور اس سے باخبر کردیتا۔ اس سلسلہ میں ایک دوسری دستاویز جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے وہ "حسن طولون کا لکھا ہوا مخطوطہ" فتح مصر" ہے۔ یہ مخطوطہ جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اور جس پر مصر کے ڈاکٹر عدنان نے کام کیا ہے۔ اس کا مصنف فتح مصر کے وقت خود موجود تھا اور اس نے تمام واقعات کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ حسن طولون تمام واقعات کا تو ذکر کرتا ہے لیکن مسئلۂ خلافت سے متعلق وہ صرف اتنا لکھکر خاموش ہو جاتا ہے کہ

"سلطان سلیم نے علماء مصر کو جمع کرکے پوچھا کہ کیا کوئی سلطان خلیفۂ اسلام کی اجازت کے بغیر سیاسی اور ملکی معاملات میں قوتِ تنفیذ کا مالک نہیں ہو سکتا؟ علماء نے کہا "نہیں۔ خلیفہ کی اجازت اس کے لئے ضروری نہیں ہے۔ سلطان سلیم نے علماء کے اس جواب کے بعد گفتگو ختم کردی، اور پھر خلیفہ سے ملاقات کے لئے نہیں گیا"۔

اس کے بعد ص ۲۶ پر محترمہ لکھتی ہیں۔ (باقی ص ۱۳۸ پر ملاحظہ ہو)

مصر، شام اور حجاز پر قبضہ ہوجانے کے باعث دولتِ عثمانیہ کا رقبہ تقریباً دوچند ہوگیا اور اس کی طاقت اس قدر مضبوط ہوگئی کہ ہنگری۔ اسپین اور اٹلی کے بادشاہوں نے اپنے سفراء کے ذریعہ ہدایا اور طرح طرح کے تحفے بھیجکر دولتِ عثمانیہ کے ساتھ صلح و دوستی کے تعلقات کو مضبوط کرنے کی خواہش ظاہر کی سلطان نے ہدایا کو بخوشی قبول کرکے اسلامی رواداری کا بین ثبوت پیش کیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان سلیم بیحد سخت گیر اور تشدد پسند تھا اور مزاج میں خودسری بھی زیادہ تھی جیساکہ مصر و شام اور ایران کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس نے خلافت کو آلِ عثمان میں منتقل کرکے جس بیدار مغزی۔ ضرورتِ وقت کے احساس اور صحیح فرض شناسی کا جو عظیم ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے۔ سلیم نے یہ محسوس کیا کہ خلافت کا اصل فرض دفاع و جہاد ہے، اس کو سیاسی اعتبار سے اتنا مضبوط ہونا چاہیئے کہ وہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت بآسانی کرسکے۔ اور دنیائے اسلام کے لئے حقیقی معنی میں ایک مرکز کا کام دے سکے۔ یہاں اس کا برعکس تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مصر و شام اور حجاز میں سیاسی اقتدار ممالیک کا تھا اور خلافت اس کے زیرِ سایہ زندگی کے سانس پورے کررہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خلافت بزرگوں کی ہڈیوں کا صرف ایک ڈھانچ تھی اور اس کے بالمقابل آلِ عثمان ڈیڑھ سو برس سے اسلام کی حفاظت وحیات اور اس کی توسیع واشاعت کی خدمات انجام

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷) "خلیفہ کا استنبول لانا بھی بہ ظاہر ایک من گھڑت افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم عصر مورخین میں سے کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اگر آخری خلیفۂ عباسی واقعی استنبول لایا گیا اور وہیں مرگیا تھا تو اب سوال یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا کہاں رہا۔ اور جب مرگیا تو کہاں دفن ہوا؟ ہمیں کسی ذریعہ سے زندگی میں اس کی جائے رہائش اور مرنے کے بعد اس کے مدفن کا علم نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی تاریخیں خلیفہ اور خلافت کے بارہ میں بالکل خاموش ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان سلیم نے اور اس کے بعد دوسرے عثمانی سلاطین نے ایک عرصہ تک اپنے لئے "خلیفہ" کا لقب اختیار نہیں کیا۔ صرف سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانہ میں خلافت کا چرچا سننے میں آتا ہے۔ ۴۴

ہم لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بالمقابل مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ کا بیان ہے کہ ترکی میوزیم میں سلاطین عثمانی کے جو سکے موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سلاطین آلِ عثمان سلطان مراد اول کے زمانہ سے ہی اپنے آپ کو خلیفۂ اسلام کہتے تھے۔

دے رہے تھے۔ ان کی تلوار سے یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی حکومتیں لرزنے لگی تھیں۔ اس بنا پر خلافت کی قبا کو زیب تن کرنے کا استحقاق آلِ عثمان سے بڑھکر اور کسے ہو سکتا تھا سچ یہ ہے کہ مصر میں خلافت اور سلطنت دونوں کا ایک ساتھ وجود اسلام کے دامن پر ایک بدنما داغ تھا جسے ترکوں نے مٹا کر اسلام کے چہرہ کو پھر ایک بار روشن و تابناک بنا دیا۔ اور اسلام کی رگوں میں زندگی کا پھر ایک نیا خون دوڑنے لگا۔

خدمتِ حرمین شریفین | اس کے علاوہ سلطان سلیم نے اپنے لئے خادم الحرمین الشریفین کا جو لقب اختیار کیا تھا اور جو چار سو برس تک ترکوں کی دستارِ عظمت و احترام کا طرہ بنا رہا۔ اس سے اس کی دینی عقیدت و ارادت اور حسن نیت کا ثبوت ملتا ہے۔ سلیم کو اہلِ حرمین کی خدمت کا موقع صرف تین سال ملا۔ تاہم اس قلیل مدت میں بھی اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے جو دولتِ عثمانیہ ج اص ۱۸۰ بحوالہ فتوحات اسلامیہ از مفتی دحلان سے ماخوذ ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں۔

"سلاطین مملوک کی طرف سے شریفِ مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا سلیم نے اس میں پانچسو دینار کا اضافہ کر دیا۔ اس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا۔ اس نے تیس آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن مجید کا ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی سلاطینِ مصر ہر سال بدوؤں اور فقراء کے لئے غلہ بھیجتے تھے۔ سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم و بیش من) غلہ اہلِ حرمین کے لئے بھیجا جائے اس سے پانچ ہزار اردب غلہ مکہ معظمہ والوں کو دیا جاتا تھا اور دو ہزار مدینہ والوں کو۔" مفتی دحلان لکھتے ہیں "سلیم کے بعد دوسرے سلاطین عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لئے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لئے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا۔ سلیم نے حرم محترم میں مقامِ حنفی کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح کو بھیجکر بہت سے رفاہی کام انجام دیئے۔ اس کی داد و دہش اور امورِ خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے

ہی دنوں میں حرمین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی۔

شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا اور تنہا طواف کرتا تھا۔ بازار مسعیٰ کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا اور اکثر یہ دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں مگر خریدنے والے بہت کم ہیں۔ لیکن اب دولت عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے۔ رزق وسیع ہے۔ خوشحالی اور فارغ البالی ہے اور لوگ اس سلطنت کے زیر سایہ امن و اطمینان میں ہیں اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں۔"

شریعتِ اسلام کا احترام

سلیم اگرچہ خودسر اور طبیعت کا ضدی تھا مگر اس کے باوجود اس کو جب کبھی متنبہ کیا جاتا تھا وہ فوراً سنبھل جاتا اور شرعی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے ایرانیوں سے غایت درجہ تعصب رکھنے کی بنا پر اعلان عام کرا دیا کہ دولت عثمانیہ کا کوئی تاجر ان لوگوں سے لین دین نہ رکھے۔ پھر معلوم ہوا کہ بعض تاجر خفیہ طور پر اس حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو اس نے ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ لیکن جب شیخ الاسلام مفتی جمالی نے بتایا کہ یہ حکم ناجائز اور نادرست ہے تو اس نے فوراً اسے واپس لے لیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ تبلیغ اسلام کے جوش میں اس نے حکم دیدیا کہ دولتِ عثمانیہ کے ممالک محروسہ میں جتنے عیسائی ہیں ان کو بجبر مسلمان بنا لیا جائے۔ اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو انھیں سپرد تیغ کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً سلیم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر کوئی غیر مسلم جزیہ دیکر اسلامی ملک میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں صاف طور پر ہے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہو سکتا۔

ترکوں کی بحری طاقت

ترکوں کی بری فوج جس قدر مضبوط تھی سلیم نے چاہا کہ ان کی بحری طاقت بھی اتنی ہی مضبوط ہو جائے تاکہ بحر روم پر دولتِ عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو سکے اور اس طرف سے ترکوں پر صلیبی حملہ

کا خطرہ مسدود ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک عظیم الشان بحری بیڑہ تیار کرایا جو مختلف سائز کے ڈیڑھ سو جدید جہازوں پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی تھے جو ہر وقت کسی مہم پر روانہ ہونے کی امید پر مسلح رہتے تھے۔ غالباً سلیم کا ارادہ جزیرہ روڈس پر حملہ کرنیکا تھا مگر ابھی اس کے انتظامات مکمل نہیں ہوئے تھے کہ پیکِ اجل آپہنچا اور ۹ شوال ۹۲۶ھ کو سلطان کا انتقال ہو گیا۔

سلیمانِ اعظم قانونی سلیم کے بعد اس کا بیٹا سلیمان تخت نشین ہوا۔ جس کی مدتِ حکومت ۹۲۶ھ سے ۹۷۵ھ تک اڑتالیس سال ہے۔ اس کا دورِ حکومت دولت عثمانیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ اس نے اپنے عہد میں یمن، حبشہ، عراق، طرابلس، برقہ، ٹیونس، الجزائر، صحرائے کبریٰ اور سوڈان ان تمام ملکوں کو فتح کر کے دولتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ اس طرح ایشیا اور افریقہ کے عربی ممالک دولتِ عثمانیہ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور دوسری جانب روم، ہنگری، سرویا، بلغاریا، بوسنیا، البانیا۔ ان سب کو مکمل طور پر فتح کر کے تمام جزیرہ نمائے بلقان پر قبضہ کر لیا جو ۱۸۲۹ء تک قائم رہا جبکہ بڑی بڑی حکومتوں کی مدد سے انھیں آزادی نصیب ہوئی۔ ہنگری کا مشہور قلعہ بلغراد سلطان محمد فاتح کے عہد میں بھی فتح نہیں ہو سکا تھا۔ اسی طرح جزیرہ روڈس صلیبی مجاہدوں کا بڑا مرکز تھا۔ سلیمان نے ان دونوں کو بھی فتح کیا۔ کریٹ اور قبرص پہلے ہی مفتوح ہو چکے تھے۔ روڈس کے فتح ہو جانے سے بحرِ روم پر بھی ترکوں کا مکمل اقتدار ہو گیا اور اب سلطنتِ عثمانیہ اپنی بری اور بحری دونوں طاقتوں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقتور اور با اقتدار حکومت ہو گئی جس کے حدود پوڈولیا اور بوواسے مصر تک اور فرات سے جبرالٹر تک پھیلے ہوئے تھے۔ غرض یہ ہے کہ سلیمان یورپ ایشیا۔ اور افریقہ تین براعظموں کے بہت سے ممالک کا فرماں روا اور بحرِ روم و بحرِ احمر دو اہم بحروں کا بادشاہ تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جن کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے۔

حسنِ انتظام و عدالت ان فتوحات اور توسیعِ مملکت کی کوششوں کے علاوہ سلیمان اعظم حد درجہ انصاف پسند

اور عدل گستر تھا چنانچہ سلیم نے چھ سو مصریوں کو جبراً مصر سے قسطنطنیہ میں منتقل کر دیا تھا سلیمان نے پھر ان کو اپنے وطن جانے کی اجازت دیدی اسی طرح سلیم نے ایران سے تجارتی تعلقات رکھنے کی پاداش میں بعض تاجروں کا مال ضبط کر لیا تھا۔ سلیمان نے ان کا مال واگذار کر دیا اور جن کو نقصانات پہنچے تھے ان کو نقد روپیہ دیکر نقصان کی تلافی کر دی۔ جن حکام پر بددیانتی اور غبن وخیانت کے الزام ثابت ہوتے تھے انھیں فوراً برطرف کر دیتا تھا۔ سلیمان کی اس جانچ پڑتال اور نگرانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ممالک محروسہ میں امن وامان کا دور دورہ ہو گیا۔ اس نے تمام حکام اور سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو تاکیدی احکام وفرامین کے ذریعہ خبردار کر دیا تھا کہ رعایا میں سے کسی کے ساتھ جبر وظلم نہ کیا جائے۔ امیر وغریب کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور انتظامی معاملات میں مسلم وغیر مسلم دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ قانون وآئین کی اس سخت پابندی کے باعث ہی سلیمان کا لقب قانونی پڑ گیا تھا۔

فوجی استحکامات سلیمان کا عہد وہ زمانہ تھا جبکہ یورپ قرون وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر ایک نئے عہد میں داخل ہو رہا تھا اور اب یہاں علوم وفنون کی گرم بازاری ہونے لگی تھی۔ اس بنا پر ان لوگوں نے فن حرب میں بھی کافی ترقی کی تھی۔ نئے نئے آلاتِ حرب ایجاد ہو چکے تھے اور جنگ کے طریقوں میں بھی بہت کچھ اصلاح ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز وسامان میں مسیحی فوجوں سے بہت آگے تھیں، توپخانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی وقلعہ سازی اور فوجی انجینرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے، کریسی لکھتا ہے "سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا اس کو اس بے فکرائی سے کوئی مناسبت نہیں تھی جو اس کے حریفوں کے لشکر میں پائی جاتی تھی"۔ [1]

رفاہِ عام کے کام ان انتظامات کے علاوہ سلیمان رفاہِ عام کے کاموں سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے

---

[1] ج ۱ ص ۲۲۴۔

قسطنطنیہ میں ایک بڑی نہر بنوائی۔ مکہ معظمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے اور پل تعمیر کرائے۔ بغداد کو فتح کرنے کے بعد وہاں امام ابو حنیفہ اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات تعمیر کرائے اور چند روز کربلا اور دوسرے مقامات کی زیارت گاہوں میں گذارے۔ اہلِ حرمین کے لئے جو وظیفہ اور غلہ عثمانی حکومت کی طرف سے جاتا تھا اس کو دوچند کر دیا۔

سلیمان کا عہد حکومت نہ صرف تاریخ دولتِ عثمانیہ میں بلکہ عالم کی تاریخ میں گوناگوں فتوحات حسنِ انتظام، رفاہِ عام ملکی امن وامان اور فوجی طاقت وقوت کے لحاظ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے ۳۰ صفر ۹۷۴ھ میں بعارضہ دردِ نقرس جبکہ اس کی عمر ۷۴ سال تھی وفات پائی۔

دولتِ عثمانیہ کے دو دور

خلافت بنی عباس کی طرح دولتِ عثمانیہ کے بھی دو دور ہیں ایک دورِ عروج اور دوسرا دورِ زوال۔ دورِ عروج عثمان خان اول بانی دولت کے استقلال ۷۰۰ھ سے شروع ہو کر سلیمانِ اعظم کی وفات ۹۷۴ھ پر ختم ہو جاتا ہے یعنی اس کی مدت کل ۲۷۴ پونے تین سو سال ہے۔ اس مدت کا مقابلہ اگر بنی عباس کے دورِ ترقی سے کیا جائے تو بڑا فرق نظر آئیگا۔

بنو عباس اور آلِ عثمان کا موازنہ

اس میں شک نہیں کہ بنو عباس کے عہد میں علوم وفنون کو جو ترقی ہوئی وہ آلِ عثمان کی سرپرستی میں نہ ہو سکی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جو فتوحات آلِ عثمان کے عہد میں ہوئیں بنو عباس کا دوران سے یکسر خالی ہے یہ زیادہ تر اندرونی خلفشار کے دور کرنے میں ہی مصروف رہے فتح قسطنطنیہ جو اسلام کا دیرینہ خواب تمنا تھا بنو عباس کے عہد میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ قدرت نے یہ سعادت بھی آلِ عثمان کے مقدر میں ہی رکھی تھی پھر صرف اسی پر بس نہیں بلکہ وسطِ یورپ میں ان کا قدم ویانا کی فصیل تک پہنچا پھر علوم وفنون یونان کی نشر واشاعت سے عقیدہ وعمل کی جو گمراہیاں عباسی دور میں پیدا ہوئیں آلِ عثمان کا دورِ حکومت ان سے بڑی حد تک محفوظ وماموں رہا۔ عثمانی سلاطین فقہ حنفی کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ترک چونکہ اصلاً بدوی تھے جفاکش

اور محنتی تھے اس لئے ان میں دوسری تباہ شدہ اقوام کے عادات وخصائل نسبتہً بہت عرصے کے بعد پیدا ہوسکے۔ سلاطین خود میدانِ جنگ میں پہنچکر افواج کی قیادت کرتے تھے اور فریضۂ جہاد کو ادا کرنا اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

پھر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اسلام کی نشر واشاعت کا جذبہ بھی بہت شدید تھا یہاں تک کہ سلیم اول نے تو ایک مرتبہ عیسائیوں کو بجبر مسلمان بنانے کا حکم دیدیا تھا جو شیخ الاسلام کی دراندازی سے بعد میں منسوخ کردیا گیا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں نسلی یا قومی عصبیت کا نام ونشان نہ تھا اور اس بنا پر بنو عباس کے عہد میں جو لڑائیاں اور ہنگامے ہوتے رہے دولتِ عثمانیہ کے عہد میں ان کا چرچا سننے میں نہیں آتا مسلم اور غیر مسلم۔ ترک اور غیر ترک سب کے ساتھ اسلامی قانون کے مطابق یکساں معاملہ کیا جاتا تھا اور غیر مسلموں کے حقوق کی نگرانی پورے طور پر ہوتی تھی۔ ان اسباب سے ممالکِ محروسہ میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ یہاں تک کہ بعض بلقانی ریاستوں کے باشندے اپنے اوطان کو چھوڑ چھوڑ کر دولتِ عثمانیہ کے زیرِ سایہ رہنے کو پسند کرتے تھے۔

علاوہ ازیں بنو عباس اور آلِ عثمان ان دونوں کی ذہنیتوں کا فرق اس طرح بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ بنو عباس میں سے جو شخص سریر آرائے خلافت ہوتا تھا وہ اپنے لئے کوئی پرشکوہ لقب اختیار کرتا تھا مثلاً مقتدر باللہ۔ المعتصم باللہ وغیرہ اور اپنے آپ کو خلافت راشدہ کا جانشین ووارث قرار دیکر امیر المومنین اور "ظل اللہ فی الارض" کہلاتا تھا لیکن اس کے برعکس آلِ عثمان "خادم الحرمین الشریفین" کو اپنے لئے سب سے بڑا سرمایۂ فخر خطاب سمجھتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے لئے جو خطاب پسند کیا تھا اس کا پورا پورا حق بھی ادا کیا۔ چنانچہ آج بھی بڈھے عربوں کے سامنے ترکوں کا ذکر آتا ہے تو ان کی آنکھوں میں ترکوں کے عہدِ گذشتہ اور ساکنان حرمین کے ساتھ ان کی قلبی محبت وارادت کا نقشہ گھومنے لگتا ہے اور بیساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں۔

ہاں! یہ درست ہے کہ ترکوں نے اپنے دورِ ترقی میں بھی مسلمانانِ عالم کی دماغی یا اجتماعی رہبری میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور نہ ان کی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ تاہم انھوں نے بحیثیت مجموعی اسلام کی مرکزیت کو سنبھالنے اور اسے ازسرِنو قائم کرنے کے سلسلہ میں دینِ قیم کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں اور مسلمانانِ عالم پر ان کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا اجر سوائے خداوند تعالیٰ اور کون دے سکتا ہے؟ بنو عباس کو قرشی اور خانوادۂ نبوت سے منتسب ہونے کا ایسا شرف ضرور حاصل تھا جس میں آلِ عثمان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر بعض لوگوں کو آخر دم تک ان کی خلافت کے تسلیم کرنے سے انکار رہا لیکن جس مذہب کا اصول "اندریں رہ فلاں بن فلاں چیزے نیست" رہا ہو اور جس کی بارگاہ قبولیت و پذیرائی میں نقدِ جان اور متاعِ عمل کی پرسش ہو نہ کہ نسبی فضیلت و برتری کی۔ اُس کے پیروکاروں سے ترکوں کی خلافت کے تسلیم کرنے میں متامل ہونا سخت حیرت انگیز امر تھا۔[1]

دولتِ عثمانیہ کا زوال

فطرت کا جو قانون عروج و زوالِ اقوامِ عالم میں شروع سے اب تک کارفرما رہا ہے دولتِ عثمانیہ اس سے کیونکر مستثنیٰ رہ سکتی تھی۔ انحطاط و زوالِ اقوام کو جسمانی امراض و عوارض پر قیاس کرنا چاہیے جس طرح کسی مضبوط اور تندرست جسم کو شروع شروع میں جب کوئی مرض لاحق ہوتا ہے اور اس کا احساس یا تو بالکل نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی طرف زیادہ اعتنا نہیں کیا جاتا اور آخرکار مریض اور اس کے بہی خواہوں کی بے توجہی مریض کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔ ٹھیک یہی حال

---

[1] مولانا شبلی نعمانی نے سلطان عبدالحمید کو خطاب کرکے کہا تھا ؎

تازگی بہ روحنین از تو ہست — زیب و طراز حرمین از تو ہست

جز تو کہ ہست اے شہِ انجم پناہ — آنکہ بود شرع نبی را پناہ

قرۂ دینِ نبوی از تو ہست — بازوئے اسلام قوی از تو ہست

شرع بجاہِ تو چو شد ارجمند — باد بفرمانِ تو چرخ بلند

یہ اشعار سلطان عبدالحمید پر صادق آتے ہوں یا نہ آتے ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شروع کے دس سلاطین پر یہ اشعار ضرور صادق آتے ہیں۔ وکفیٰ بہ فخراً۔

قومی زوال وانحطاط کا ہوتا ہے۔ جب کسی بدعملی یا غفلت وسہل انگاری کے باعث کسی قوم یا حکومت کے جسم کو زوال وادبار کا مرض لاحق ہوتا ہے تو قدرتی طور پر اس پہ دو نتائج مرتب ہوتے ہیں اگر قوم کے دل و دماغ بیدار ہیں اور وہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو محسوس کر کے فوراً ہی ان کی تلافی کر لیتی ہے تو ادبار ٹل جاتا ہے اور اور اس کی اصلی اور پہلی شان جلد ہی عود کر آتی ہے لیکن اگر اس کے برعکس اس قوم کو اپنی غلطیوں، کوتاہیوں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اپنے گناہوں اور جرموں پر تنبہ نہیں ہوتا تو ادبار اس قوم اور حکومت کے جسم کو گھن کی طرح لگ جاتا ہے اور ممکن کیا بلکہ اغلب ہے کہ ابتدا میں اس کا پتہ نہ چلے یا کسی اور پہلو سے تھوڑی بہت تلافی ہوتے رہنے کے باعث اس کا ہر وقت ادراک واحساس نہ ہو لیکن ادبار کے یہ جراثیم اندر ہی اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور آخر کار ایک دن جسد حکومت کی شرائنوں میں زہریلا مادہ پیدا کر کے اسے گلا سڑا کر تباہ کر دیتے ہیں۔

اسبابِ زوال | جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے سلیمانِ اعظم کا دورِ حکومت دولتِ عثمانیہ کا انتہائی نقطۂ عروج تھا جس کے بعد اس کا انحطاط شروع ہو گیا۔

لِکُلِّ شیٍٔ اذا ما تمّ نقصانٌ فلا یغرّ بطیبِ العیش انسانٌ[۵۱]

بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ خود سلیمان اعظم کے آخری دورِ حکومت میں ہی دولتِ عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اور بہ قول محترمہ خالدہ ادیب خانم کے اس کا اولین سبب یہ ہوا کہ اگرچہ سلیمان تین براعظموں اور دو بحروں پر حکومت کر رہا تھا اور اس کی فوج بھی اتنی مضبوط تھی کہ یورپ کی دول متحدہ کو بری اور بحری دونوں قسم کی لڑائیوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی لیکن دراصل وہ خود محکوم تھا اور اس کے اقلیم قلب و دماغ میں اس کی روسی بیگم جس کو اہلِ مغرب روکسلین (Roxalane.) کہتے ہیں اس کی حکومت و بادشاہت کا سکہ چل رہا تھا۔"[۵۲]

---

[۵۱] ہر شے جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں نقصان شروع ہو جاتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ زندگی کے ناز و نعم پر مغرور نہ ہو۔

[۵۲] Conflict of East and West in Turkey. P. 36

اس روسی بیگم کے بطن سے سلیمانِ اعظم کا ایک لڑکا تھا جو نہایت آوارہ بدچلن اور شراب خوار تھا بیگم کی خواہش تھی کہ سلیمان کے بعد اس کا یہ بیٹا ہی تخت نشین ہو۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سلطان کا ایک اور لڑکا مصطفیٰ جو کسی اور بیوی سے تھا، ولی عہد قرار پا چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ مصطفیٰ اپنی فوجی اور دماغی و انتظامی قابلیت کے لحاظ سے بجا طور پر اس کا مستحق بھی تھا۔ اس بنا پر اب حرم سلطان (روسی بیگم) نے ایک سازش کی اور آخر کار سلیمان کو مصطفیٰ کی طرف سے بدگمان کر کر کے یہ باور کرا دیا کہ مصطفیٰ خود سلیمان کی زندگی میں ہی تخت و تاج کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے چنانچہ ۱۵۵۳ء میں جب ایران سے جنگ کرنے کے لئے مصطفیٰ اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر رہا تھا سلیمان نے اس کو اپنے خیمہ میں طلب کیا اور اپنے سامنے ہی گلا گھونٹ کر مروا ڈالا۔ مصطفیٰ کی طرح اس کے دوسرے بھائی بایزید غریب کا حشر بھی یہی ہوا۔ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب خود اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ بعض ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ اسے اپنی حفاظت کے لئے سلیم (حرم سلطان روسی بیگم کے لڑکے کا نام) کے خلاف تلوار اٹھانی چاہئے۔ بایزید کو یہ مشورہ مناسب معلوم ہوا اور اس نے سلیم کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن سلیمان کی طاقت سلیم کے شامل حال تھی۔ اس بنا پر بایزید شکست کھا گیا اور اسے ایران کے شاہ طہماسپ کے دامنِ عطوفت میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن جب سلیمان نے شاہِ ایران کو جنگ کی دھمکی دی اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ بھی کیا تو اس نے مجبوراً شہزادہ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیر کے حوالہ کر دیا جس نے ان سب کو فوراً قتل کر ڈالا۔

شہزادہ مصطفیٰ اور بایزید کے قتل ہو جانے کے بعد اب سلیم ثانی کے لئے راستہ بالکل صاف تھا چنانچہ ۹۷۴ھ میں سلیمانِ اعظم کے انتقال کے بعد ہی افسر و اورنگ کا مالک ہوا۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے سلیم ثانی انتہا درجہ نااہل اور نالائق تھا۔ اسے بادہ پرستی اور عیش کوشی کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا، تمام امور سلطنت صدر اعظم کے ہاتھ میں تھے وہ چونکہ سلیمان اعظم کے عہد کا تربیت یافتہ تھا اس لئے سلیم ثانی کے ابتدائی دور حکومت میں جب تک صدر اعظم کا اقتدار رہا حکومت میں زوال کے آثار نمایاں نہیں ہوئے لیکن

اربابِ نظر کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ اب دولت عثمانیہ کی عمارت میں تزلزل پیدا ہونے لگا ہے۔

پھر جیسا کہ محترمہ خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں "سلیمان نے حرم سلطان کے اثر سے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنا جانشین ایک نہایت ہی نااہل اور نالائق شہزادہ کو بنایا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو سلیم کا سلطان بننا غالباً ایسے برے نتائج کا موجب نہ ہوتا کیونکہ کسی سلطنت کا نظام مستحکم ہوتا ہے تو بادشاہ کی نالائقی کا تدارک اچھے کارکنوں کے حسنِ انتظام سے ہو جاتا ہے مگر حرم سلطان نے تو سلیمانِ اعظم کو اس پر بھی آمادہ کیا کہ وہ شہزادوں کو محل میں ہی بند رکھکر تعلیم و تربیت دلانے کا رواج ڈالدے۔ یہیں سے شاہی خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ شہزادوں کی تعلیم کے نصاب سے جسمانی تربیت اور عملی تجربے خارج کر دیئے گئے، قدیم زبانیں اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم ان کو اب بھی دیجاتی تھی لیکن تخت نشینی کے وقت تک وہ قصرِ شاہی کے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس نئے رواج (Cage System) کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایسے ایسے لوگ بادشاہ ہونے لگے جو بند محل میں تعلیم پاتے تھے۔ عیش و عشرت اور تن آسانی کے عادی تھے اور جنھیں کاروبارِ سلطنت سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔

سترہویں صدی میں اول سے آخر تک نااہل سلطانوں کا ایک سلسلہ بندھا ہوا نظر آتا ہے، ان میں جو عیش پرست نہیں تھے وہ پرلے درجہ کے ظالم و جابر تھے اور جو حرم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ انتہا سے زیادہ بد اطوار تھے ان کی منظورِ نظر بیگمات سلطنت کے بڑے بڑے عہدے فروخت کرنے لگیں، ترکی زبان میں ایک کہاوت ہے "مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے"۔ حرم اور بادشاہوں کا یہ رنگ دیکھکر عُمّال عثمانی بھی اسی رنگ میں رنگے جانے لگے یہانتک کہ رشوت دیکر عہدے حاصل کرنا ایک معمولی بات ہوگئی پہلے قابلیت ترقی کا معیار تھا مگر اب اس کی کوئی پرسش نہیں رہی۔ غرض یہ ہے کہ جو سلاطینِ عثمانی مردانہ شجاعت و بہادری میں قدیم رومی بادشاہوں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ اب وہ بازنطینی حکمرانوں کی طرح (آرام پسند اور تن آسان) ہونے لگے، اس زمانہ کا عثمانی قصرِ شاہی بازنطینی محل شاہی کا جواب تھا۔

اس دورِ تنزل میں بہت کم سلطان ایسے ہوں گے جو طبعی موت سے مرے ہوں کیونکہ اس صدی میں فوجوں کی بغاوت اور فرماں رواؤں کی معزولی کا بازار گرم تھا اس بنا پر وہ اکثر قتل کر دیئے جاتے تھے[۱۵] جیسا کہ محترمہ خالدہ ادیب خانم اور دوسرے مورخین کا خیال ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولتِ عثمانیہ کا زوال سلیمانِ اعظم کے بعد سے ہی شروع ہوا لیکن ہمارے خیال میں اس زوال کے جراثیم عہد سلیمانی سے بہت پہلے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے اور خود عثمان خاں غازی نے جس نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی تھی وہ زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتا تھا۔

ولی عہدی | اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ولی عہدی کا رواج ہے، اسلام نے بادشاہ یا خلیفہ کے لئے جو انتخابی طریقہ تجویز کیا ہے وہی حکومت کو مضبوط اور پائیدار بنانے کا کفیل ہو سکتا تھا۔ ولی عہدی کے رواج کا اثر جیسا کہ عہد بنی عباس میں بکثرت ہوا۔ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ چونکہ بادشاہِ وقت کا ہر بڑا لڑکا یہ یقین رکھتا ہے کہ باپ کے بعد وہ لازمًا تخت و تاج کا مالک ہو گا اس بنا پر اس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی کہ وہ شاہانہ عادات و خصائل پیدا کر کے اپنے تئیں اس منصبِ رفیع کا مستحق بھی ثابت کرے وہ سمجھتا ہے کہ حکمرانی کی عدم صلاحیت کے باوجود بہر حال وہی بادشاہ ہو گا۔ دوسری جانب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ اربابِ اغراض ولی عہد کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ازراہِ تملق ولی عہد کے ہر کام کو سراہ کر اور اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ولی عہد کے دل میں اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ولی عہد کو اپنی کمزوریاں محسوس نہیں ہوتیں اور وہ عمر بھر خود غلط بنا رہتا ہے پھر جب وہ ولی عہدی سے ترقی کر کے تخت نشین سلطنت ہوتا ہے تو اب بھی اربابِ اغراض اس کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور اس سے ملک میں طرح طرح کے فتنے اور ہنگامے پیدا ہوتے ہیں۔

ان مفاسد کے علاوہ ولی عہدی کے رواج کا سب سے زیادہ الم ناک اور ہلاکت انگیز نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قصرِ شاہی طرح طرح کی ناپاک سازشوں اور فریب کاریوں کا مرکز بن جاتا ہے اور ان کا ظہور بسا اوقات

[۱۵] Confict of East and West in Turkey. P: 36, 37

نہایت ہی دردناک قتل کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سلطان بایزید ایلدرم نے اپنے برادرِ خورد یعقوب چلپی کو جو شجاعت و دلیری میں اپنے بڑے بھائی سے کم نہ تھا محض اس خوف سے کہ سلطنت کا نزاع برپا نہ ہو اور سلطان سلیم اول نے اپنے دو بھائیوں احمد اور کرکود کو قتل کرایا۔ دولتِ عثمانیہ کا نامور تاجدار اور تاریخ اسلام کا بلند مرتبت ہیرو سلطان محمد فاتح، قسطنطنیہ کی عظیم الشان فتح جس کی قبائے عظمت کا ایک تکمۂ زریں ہے اس نے بھی عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دودھ پیتے بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا، عین اس وقت جبکہ بچہ کی ماں سلطان کی خدمت میں تخت نشینی کا ہدیۂ تہنیت پیش کر رہی تھی حوض میں غرق کرا کر ہلاک کرا دیا۔" پھر محمد فاتح نے اپنے اس فعل پر نادم اور پشیمان ہونے کے بجائے بمصداق "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" یہ بھی کیا کہ "حکومت و سلطنت کے تحفظ کی خاطر بھائیوں کے قتل کو قانوناً جائز ہی قرار دیدیا۔"[۵۱] جسے مورخین عام طور پر "خونین قانون" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ نیا اجتہادی حکم کس حد تک شرعی اور اسلامی حکم کہلانے کا مستحق ہے سوال یہ ہے کہ کیا ایک شیر خوار بچہ سے بھی فاتح قسطنطنیہ کی حکومت کو فنا ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں ایک فاتح کی اندرونی ذہنیت بے نقاب ہو جاتی ہے اور یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ اس کی فتوحات کا مقصد کس حد تک خالص اسلامی اور دینی ہے سلطان محمد فاتح کے اس ناجائز اور سراسر خونین قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مراد ثالث نے اپنے پانچوں بھائیوں کو اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے اپنے ۱۹ بھائیوں کو اسی قانون کی آڑ لیکر بے رحمی سے قتل کرا دیا۔

غرض یہ ہے کہ ان تمام مفاسد اور خود غرضانہ سفاکیوں کا اصل منبع ولی عہدی کا رواج تھا ورنہ اگر اسلام کا دستور جمہوری انتخاب مروج رہتا تو ہر امیدوارِ سلطنت اپنی سیرت اور اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ پسندیدہ بنا کر جمہور کی رائے کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرتا۔ اور پھر جو شخص بھی بادشاہ ہو جاتا تو چونکہ رائے عامہ کی قوت اس کی پشت پر ہوتی اس لئے کسی کو اس کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

---

[۵۱] دولتِ عثمانیہ ج ۱ ص ۱۴۵۔

اجنبی عورتوں سے شادی

دوسرا سبب یہ ہے کہ عثمانی سلاطین شروع سے ہی شادی بیاہ کے معاملہ میں غیر محتاط تھے یعنی انھوں نے غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنے اور انکو محل کے تمام معاملات میں دخیل بنا کر رکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی چنانچہ اورخاں نے کنتا کوزین کی لڑکی تھیوڈورا سے شادی کی اور اسے مذہبِ عیسوی پر ہی قائم رہ کر زندگی بسر کرنے کی اجازت دی۔ اورخاں کے بعد اس کے جانشین سلطان مراد اول نے بلغاریا کے بادشاہ سیسمان کی لڑکی سے شادی کی۔ سلطان بایزید ایلدرم نے سرویا کے بادشاہ کی بہن ڈسپینا سے نکاح کیا۔ پھر سلیمان اعظم کے نکاح میں جو روسی خاتون خرم سلطان تھی اور اس کی وجہ سے دولتِ عثمانیہ پر جو آفت آئی اس کا حال آپ ابھی گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ تو وہ شہزادیاں تھیں جو محل سلطانی میں بیگم بن کر رہتی تھیں اور جو سلطنت کے معاملات میں دخل دینا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ ان کے علاوہ جو غیر مسلم باندیاں اور کنیزکیں محل میں عمل دخل رکھتی تھیں ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ چنانچہ استاذ کرد علی دولتِ عثمانیہ کے اسبابِ زوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولعلہ یعد من الاسباب الجوھریۃ فی الانحطاط	آلِ عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب
تغیر الدم السلطانی فی آل عثمان تغیرا کبیرا	یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزکوں کی
لکثرۃ ما اقتنوا من السراری والجواری	کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت
النصرانیات [1]	زیادہ بدل گیا تھا۔

چنانچہ سلیم ثانی آدھا روسی تھا، کیونکہ اس کی ماں روس کی باشندہ تھی۔ محمد ثالث آدھا اطالوی تھا اس لئے کہ اس کی والدہ شہر وینس (Venice) کی رہنے والی تھی۔ اسی طرح عثمان ثانی، مراد رابع اور ابراہیم اول نصف رومی تھے، ان سب کی مائیں رومی خواتین تھیں۔

غیر مسلم خواتین کی محل میں کثرت کا نتیجہ وہی ہوا جو بنو عباس کے عہد میں رونما ہو چکا تھا۔ یعنی

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲ ص ۹۹م۔

جب تک سلاطین جری، بہادر اور بیدار مغز پیدا ہوتے رہے، ان غیر مسلم خواتین کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے، لیکن جب سے سلیم ثانی، مراد ثالث اور مصطفیٰ اول جیسے عشرت پسند اور عیش کوش سلاطین تختِ حکومت پر قابض ہونے لگے تو عنانِ سلطنت بھی انھیں جواری وسراری کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی، دولتِ عثمانیہ کے لائق مصنف لکھتے ہیں۔

مراد ثالث (۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ) کے عہد کے ابتدائی چار سال صوقولی پاشا کی صدارت کے تھے پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بروز زیادہ ہوتا جارہا تھا۔ حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا۔ اور امور سلطنت کا انصرام حقیقۃً ان ہی خواتین کے منشا کے مطابق ہوتا تھا۔ ان میں ایک سلطانہ والدۂ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی جو وینس کے مشہور اور سرآوردہ خاندان بفو (Baffo) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسن صورت اور ذکاوت طبع کے باعث مراد پر حد درجہ حاوی تھی۔ صفیہ کو سلطنت کی جنگ وصلح میں خاص دخل تھا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا۔ محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی۔ تیسری ایک ہنگری خاتون تھی جس نے کچھ دنوں کے لئے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھی۔ یہی چار خواتین سلطان کی مشیر کار اور انتظام حکومت کی حقیقی نگراں تھیں۔" [۵۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابیات یعنی عیسائی اور یہودی خواتین کے ساتھ ازدواجی تعلقات رکھنا اسلام میں حرام نہیں بلکہ جائز ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر اسلامی سوسائٹی میں یا محل سلطانی میں ان خواتین کا اثر واقتدار بڑھ جائے تو پھر یہ تباہ کن نتائج واثرات کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حذیفہ بن الیمان نے مدائن میں ایک یہودی خاتون سے نکاح کر لیا تو حضرت عمرؓ نے

---

[۵۱] دولتِ عثمانیہ ج ۱ ص ۲۴۰

ان کو بتاکید لکھا کہ تم اس عورت کو چھوڑ دو" حذیفہ نے پوچھا "کیا یہ حرام فعل ہے؟ حضرت عمرؓ نے پھر اس کے جواب میں تحریر فرمایا "میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم میرے خط کو پڑھکر اسے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی پہلے اس خاتون سے تعلق منقطع کرلو۔ مجھکو اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمان تمہاری پیروی کرکے ذمیوں کی خواتین سے ان کے حسن وجمال کی وجہ سے نکاح کرنا شروع نہ کردیں" اگر ایسا ہوا تو مسلمان خواتین کے لئے یہی فتنہ کچھ کم نہیں ہوگا" لہ

فوج کی سرکشی

قصرِ شاہی کے ان ناگفتہ بہ حالات کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ فوج میں اطاعت اور فرماں برداری کا جذبہ باقی نہ رہے۔ طوائف الملوکی عام ہوجائے اور امرار اور وزرار کسی بات کا اندیشہ کئے بغیر جو چاہیں کر بیٹھیں۔ ینی چری ترکوں کی ایک نہایت ہی منتخب اور بہادر فوج تھی، یہاں تک کہ اگر اس کو سلطنت کا دست راست بھی کہا جائے تو بجا ہے لیکن سلطان مراد ثالث کی عیش کوشی اور امورِ سلطنت کی طرف سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج سلطان سے باغی ہوگئی اور ۱۵۸۹ء میں اس نے قصرِ سلطنت کے سامنے عام مظاہرہ شروع کردیا۔ سلطان کو اس وقت فوج کے سامنے جھکنا پڑا اور جو ان کا مطالبہ تھا وہ پورا کردیا گیا۔ سلطان کے اس فعل سے فوج کو اس قدر جسارت ہوگئی کہ وہ جب چاہتی تھی اپنے کسی ایک مطالبہ کو منوانے کے لئے علم بغاوت بلند کردیتی تھی۔ یہاں تک کہ صدرِ اعظم اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے تقررات بھی انھیں لوگوں کے منشا اور خواہش کے مطابق ہونے لگے رفتہ رفتہ نوبت یہانتک پہنچی کہ عہد آخر کے خلفارِ عباسی کی طرح سلاطین عثمانی بھی ان کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح رہنے لگے۔ اور سلطنت ان لوگوں کی اغراض کا ایک بازیچہ بن گئی۔

امرار اور وزرار کی خیانت وغداری

ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ چھوٹوں سے لیکر بڑوں تک کے اخلاق تباہ و برباد ہوگئے۔ نفسانیت اور غرض پرستی ہر ایک کا شیوہ بن گئی۔ امرار اور وزرار کی

لہ کتاب الآثار للامام محمد مطبوعہ ہند ص ۶۴

خیانت وغداری یہاں تک پہنچی کہ انھیں دولتِ عثمانیہ کے سخت ترین دشمنوں سے ساز باز کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا اور عین جنگ کے مواقع پر اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان سے ملجاتے تھے، دولتِ عثمانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن روس تھا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں روس کا شہنشاہ پیٹر اعظم قسطنطنیہ کی فتح کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین بنا کر عثمانی علاقوں پر لشکر کشی کے ارادہ سے روانہ ہوا اور دریائے پرتھ کو عبور کرنے کے بعد ساحل پر اپنے ڈیرے خیمے نصب کر دئیے تو اس وقت اسے معلوم ہوا کہ ترکی کا صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا سامنے کی پہاڑیوں پر دو لاکھ کا لشکر عظیم لئے پڑا ہے، اس وقت جنگی اعتبار سے شہنشاہِ روس نہایت خطرناک پوزیشن میں تھا اس کی فوج تعداد میں ترکی فوج سے کم تھی۔ پھر ایک طرف دریا تھا۔ اور دوسری جانب ایک وسیع دلدل اور سامنے ترکی کی فوج گراں تھی اگر محمد پاشا چاہتا تو پیٹر اعظم کو قتل یا گرفتار کر سکتا تھا لیکن شہنشاہ کی ملکہ کیتھرائن نے جو حسن وجمال کے علاوہ ذہانت وذکاوت میں ممتاز تھی تدبیر یہ کی کہ بہت کچھ مال ودولت۔ سونا اور زیورات بلطہ جی محمد پاشا کے نائب کے پاس بہ طور نذرانہ بھیجدیا۔ اور نائب نے صدر اعظم محمد پاشا کو آمادہ کیا کہ وہ ایک معاہدہ کر کے اپنا محاصرہ اٹھالے، چنانچہ یہی ہوا اور روس کی فوج سلامتی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ سلطان عبدالمجید کے عہد میں ہوا۔ محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترکوں کو نصیبین میں شکست فاش دی جس سے اغلب یہ تھا کہ ابراہیم کا اقتدار ایشیائے کوچک میں بڑھ جائیگا۔ ایسے نازک موقع پر احمد پاشا قپودان نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لاکر خدیو مذکور کے حوالہ کر دیا اگر انگلستان بیچ میں نہ آپڑتا تو بہت ممکن تھا کہ خدیو مصر قسطنطنیہ پر بھی قابض ہو جاتا اور ترکی سلطنت صفحۂ ہستی سے ہی مٹ جاتی۔

سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد میں انگریز جزیرۂ سائپرس کو لینا چاہتے تھے مگر سلطان اس کے لئے تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جب صفوت پاشا صدر اعظم مقرر ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جزیرۂ مذکور کو

انگریزوں کے سپرد کردیا۔ اور سلطان کو یہ کہکر تسکین دیدی کہ انگریز برلن کانفرنس میں ہماری مدد کرینگے۔

یہ اسباب تو وہ ہیں جو اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جزئی طور پر ان سے جو اور چند خرابیاں پیدا ہوئیں ان کو مختصراً نمبروار اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

اقتصادی تنزل ترک اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے نہایت جفاکش اور محنتی قوم ہے، مشینری کے دور سے پہلے ان کی اقتصادی حالت بہت اچھی رہی کیونکہ اپنے ہاتھوں سے زراعت کرتے تھے اور صنعت وحرفت کے کاموں میں بھی دخل رکھتے اور انھیں بڑی محنت اور تن دہی سے انجام دیتے تھے، لیکن جب مشینری کا عہد شروع ہوا اور ہاتھ کی محنت ومشقت کے بجائے مشین سے کام لیا جانے لگا تو چونکہ حکومت کی جانب سے ترکوں کے لئے مشینوں سے کام کرنے کے مواقع بہم نہیں پہنچائے گئے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی دوڑ میں ترک اپنی ہمسایہ قوموں کے حریف نہیں بن سکے اور ان کی حالت روز بروز ناگفتہ بہ ہونے لگی۔

علماء کا جمود اس قومی انحطاط وتنزل کا اثر علماءِ کرام کی جماعت پر بھی ہوا۔ جو عوام وخواص پر بلکہ خود حکومت پر اپنا بڑا اثر واقتدار رکھتے تھے۔ خالدہ ادیب خانم علماء کی اس غفلت شعاری کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں؛

> "جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ (علماء) اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسۂ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم وفنون کے مرکز تھے مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئی علم وحکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ رہی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرہویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا ہے۔ یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا۔ ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کا طرزِ خیال جذبۂ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔"[1]

[1] ترکی میں کشمکشِ مشرق ومغرب، خطبۂ دوم۔

یہ علمار لکیر کے فقیر تھے اور کسی نئی اصلاح کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے چنانچہ جب سلطان سلیم ثالث (از ۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ) نے اپنی تعلیمی اور فوجی اصلاحات کی اسکیم کو نافذ کرنا چاہا جس کا مفاد یہ تھا کہ ترکی میں جدید علوم و فنون کے مدارس قائم کئے جائیں اور فوج کو جدید فن حرب سے واقف کرکے اسے جدید آلات و اسلحۂ حرب سے آراستہ کیا جائے تو اس اسکیم کی مخالفت سب سے زیادہ اسی جماعت کی طرف سے ہوئی۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیدیا کہ جدید قسم کا فوجی لباس پہننا شعائرِ اسلام کے خلاف ہے۔ ترکی کی مشہور فوج ینی چری اصلاحات کی مخالفت میں علمار کی ہم نوا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فوج نے سلطان کے خلاف بغاوت کردی اور جو جو وزرار اور اعیان مملکت اصلاحات کے معاملہ میں سلطان کے حامی تھے ان سب کو چن چن کر آت میدان میں لاتے تھے اور بے دردی سے قتل کردیتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ قتل کا یہ سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ سلطان سلیم نے فوج کی یہ خودسری اور شورش پسندی دیکھکر مجبوراً تمام اصلاحات کے منسوخ کرنے کا اعلان عام کردیا، مگر ان فتنہ پردازوں کی آتشِ غیظ و غضب پھر بھی سرد نہیں ہوئی اور انھوں نے مفتی اعظم اور شیخ الاسلام سے شرعی جواز کی سند حاصل کرکے سلیم کو معزول کردیا۔

۱۲۹۳ھ میں جب سلطان عبدالحمید ثانی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی ملک کی اندرونی حالت کی غایت درجہ ابتری اور ممالک خارجہ کی ترقی سے متاثر ہوکر اصلاحات ملکی کی ایک اسکیم نافذ کرنی چاہی مگر اس غریب کا حشر بھی یہی ہوا کہ شریعتِ اسلام کے نام پر فوج کے بعض حصے دستور اصلاحات کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر کار شیخ الاسلام سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد سلطان کو تخت سے اتار دیا گیا۔

ترکی کی حریف اقوام کی بیداری | ایک طرف ترکی کی یہ حالت تھی کہ جمود و بے حسی اور غفلت و جہالت کے تاریک بادلوں میں لپٹی ہوئی تھی اور دوسری جانب اس کا حریف یورپ دورِ جہالت و نادانی سے

نکلکر علوم وفنون کے چمن زار میں سانس لے رہا تھا۔ فوجیں نئے نئے آلاتِ حرب سے مسلح ہو رہی تھیں اس بنا پر اب یورپین اقوام کے دل میں طبعی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ترکی کے حصے بخرے کرلئے جائیں اور اس "مردِ بیمار" کو ایسی ضرب کاری لگائی جائے کہ اس کا سانس اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جائے۔ یورپین اقوام کے ان منصوبوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، روس، یونان اور دوسری بلقانی ریاستوں نے انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ سازباز کرکے ترکی پر یورشیں شروع کردیں اور اب عثمانی مقبوضات یکے بعد دیگرے ترکوں کے قبضہ سے نکلنے شروع ہوگئے۔ جنگِ پلونا کے بعد جنگِ بلقان اور عالمگیر جنگ کی یاد اب تک بہت سے لوگوں کے دلوں میں تازہ ہوگی۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحرِ روم کے مشہور جزائر کریٹ قبرص اور مالٹا ترکوں کے قبضہ سے نکلے۔ پھر بغداد، شام، لبنان اور فلسطین سے موصل تک کا سارا علاقہ ان سے چھین لیا گیا۔ جو بلقانی ریاستیں ترکی کی باج گذار تھیں وہ آزاد ہوگئیں اور خود ایشیائے کوچک کے بھی حصے بخرے ہوگئے۔

عربوں کی بغاوت | جنگِ عالمگیر (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ جو ترک سلطان سلیم اول کے زمانہ سے اب تک اپنی چند در چند کوتاہیوں اور سیاسی زبوں حالیوں کے باوجود اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین کہلانے پر فخر کرتے آئے تھے ان کے ساتھ عربوں اور خصوصاً شریفِ مکہ نے نہایت غداری اور خدع وفریب کا معاملہ کیا۔ ان لوگوں کو "خودمختار عرب اسٹیٹ" کا ایک ایسا سبز باغ دکھایا گیا کہ انھوں نے اسلامی اخوت اور اپنے دینی فرض سے اغماضِ نظر کرکے ترکوں کے دشمنوں سے سازباز کرلیا اور جو ترکی سپاہ حجاز میں تھی اُسے نکال دیا۔ (مگر شکر کا مقام ہے کہ اب عربوں کو اپنی غلطی کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہیں)

خلافت کا خاتمہ | بہر حال ترکی کے "مردِ بیمار" کا ضعف اس درجہ تک پہنچ گیا تھا کہ اگر مصطفیٰ کمال اور ان کے رفقا ایسے اربابِ عزم، باہمت اور بلند حوصلہ نوجوان پیدا نہ ہوتے تو وہ زندگی کے آخری سانس لیکر

ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن ترکی کو دشمنوں اور بدخواہوں کے علی الرغم ابھی دنیا میں ایک زندہ قوم کی طرح رہنا تھا اس لئے مصطفیٰ کمال کی مسیحا نفسی سے اس کے تنِ مردہ میں پھر ایک روح تازہ پیدا ہو گئی اور آج وہ اس قابل ہے کہ مغرب کی بڑی سے بڑی حکومت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بات چیت کرکے ترکی بے شبہ آج زندہ ہے۔ اس کو اس سے چھنے ہوئے علاقے جن پر یونانی قبضہ کر بیٹھے تھے وہ بھی واپس مل گئے ہیں اور وہ صنعت و حرفت۔ تعلیم و معاشرت، فوجی تنظیم و تربیت وغیرہ کے لحاظ سے آج یورپ کی کسی قوم سے پیچھے نہیں، لیکن اب ترکی صرف اپنے لئے زندہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب کہ وہاں خلافت کا الغا کیا گیا۔ اس وقت سے اس کا تعلق عالمِ اسلام سے منقطع سا ہو چکا ہے اور اس کا فیصلہ ابھی نہیں بلکہ مستقبل میں ہو گا کہ ترکی کو مغربی اقوام کے ہمسر ہونے کے جذبہ میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے "المومنون اخوۃ" کا سبق بھی یاد رہا یا نہیں؟

حالتِ امروز آج ہمارے بہت سے خوش خیال حضرات کہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کر رہے ہیں۔ ترکی کی طرح ایران اور مصر بھی ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہے اور افغانستان بھی جدید تہذیب تمدن کی روشنی سے جگمگا رہا ہے! ہاں یہ سب صحیح ہے لیکن یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ اگر ان سب اسلامی ملکوں کی یہ ترقی بحیثیت مسلمان ہونے کے اور اسلام کو سربلند و سرفراز کرنے کے لئے ہے تو ہم سے زیادہ کسی اور کو ان ترقیات پر خوش ہونے کا حق نہیں ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ افغانستان کی ترقی افغانی قوم کے لئے ترکی کا عروج ترکوں کے واسطے اور ایران و مصر کی ترقی ایرانی اور مصری قوم کے لئے ہی اور بس! تو کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ان ملکوں کو اس ترقی پر کوئی مبارکباد پیش نہیں کر سکتا۔

حال اور ماضی کا موازنہ گذشتہ اوراق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے انحطاط و تنزل کی داستان خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد سے ہی شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ سمجھنا ایک شدید غلطی ہو گی کہ ہمارے آج اور کل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا کل آج سے کہیں زیادہ بہتر تھا اور ہمارا عہد ماضی خواہ

متعدد اسباب ووجوہ کے ماتحت وہ کیسا ہی تنزل پذیر ہو، بہرحال ہمارے حال سے بدرجہا امید آفریں اور حوصلہ افزا تھا۔ اس کے متعدد اسباب ہیں جنھیں ذیل میں مختصراً بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ ہم کو اپنی موجودہ پستی کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے۔

گذشتہ ایامِ زوال میں سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اندرونی اور بیرونی طور پر خواہ حالت کیسی ہی خراب وخستہ ہو بہرحال مسلمانوں کی اپنی حکومت وسلطنت تھی۔ اس بنا پر اول تو جو فاسق وفاجر بادشاہ ہوتے تھے وہ بھی حرمات وشعائر اللہ کی توہین کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور چونکہ علمارِ حق کا گروہ ہر دور میں موجود رہا ہے اس لئے وہ موقع ومحل کے مناسب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کو ادا کرنے سے غافل نہیں رہتے تھے اور اس طرح کسی نہ کسی حد تک صورتِ حالات کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ خلیفہ ذاتی طور پر خواہ کیسا ہی مستبد ہو لیکن علمارِ حق کے سامنے اُسے بھی جھکنا پڑتا تھا۔ یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ بعض خاص خاص مواقع پر علمار کے اس اثر نے حکومتوں میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔

علمارِ حق کی مساعی اصلاح اس نوع کے واقعات تذکرہ وتاریخ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں ان میں سے چند واقعات کا ذکر بہ طور نمونہ مشتے از خروارے نامناسب اور بے محل نہ ہوگا۔ مشہور اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو ولیعہد بناوے لیکن اس زمانہ کے مشہور تابعی امام حضرت رجا بن حیوہ کے مشورہ کے مطابق اس نے اپنی اس رائے سے رجوع کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اپنی زندگی میں ہی ان کے لئے بیعت لے لی جس سے پھر ایک مرتبہ خلافت راشدہ کا منظر لوگوں کو نظر آگیا۔

حجاج کے نام اور اس کی سفاکی وبے رحمی سے کون واقف نہیں۔ ایک مرتبہ اس کے سامنے امام حسینؓ کا ذکر آیا تو بولا "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات میں داخل نہیں تھے۔ اس مجلس میں اتفاق سے مشہور تابعی عالم یحییٰ بن یعمر بھی موجود تھے انھوں نے فرمایا "تو جھوٹ بولتا ہے" حجاج نے کہا "اس کو

یا تو قرآن سے ثابت کرو ورنہ میں گردن اڑا دونگا" اب حضرت یحییٰ بن یعمر نے آیت وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمَانَ الآیہ پڑھی اور فرمایا کہ "جب اس آیت کے بموجب حضرت عیسیٰ ماں کے رشتہ سے حضرت آدمؑ کی ذریت میں داخل ہیں تو امام حسینؑ ماں کے توسط سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں کیوں داخل نہیں؟"
حجاج بلا کا شعلہ مزاج تھا مگر اس وقت یحییٰ بن یعمر کی حق گوئی کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ بولا "سچ کہتے ہو میں اس آیت کو پڑھتا تھا مگر کبھی ذہن ادھر منتقل نہیں ہوا۔ بخدا یہ استنباط تو بہت ہی عجیب و غریب ہے۔

انہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ حجاج نے ان سے دریافت کیا "میں لحن یعنی اعراب میں غلطی تو نہیں کرتا؟" یحییٰ بن یعمر نے اس کا نہایت بلیغ جواب دیا فرمایا "ترفع ما یخفض وتخفض ما یرفع" حجاج کے سوال کے مطابق اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ تم کسرہ کی جگہ رفعہ اور رفعہ کی جگہ کسرہ پڑھ دیتے ہو مگر اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ تو بڑا بے انصاف اور ظالم ہے جو پستی کے مستحق کو بلندی دیتا ہے اور سربلندی کے مستحق کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔" ابن خلکان کا بیان ہے کہ حجاج اس حق گوئی پر اس درجہ مسرور ہوا کہ یحییٰ بن یعمر کو خراساں کا قاضی مقرر کر دیا۔

امام اوزاعی شام کے امام تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ عباسی سفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے ان سے دریافت کیا "ہم نے بنو امیہ کی جو خونریزی کی ہے اس کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ امام اوزاعی نے پہلے تو ٹالنا چاہا مگر جب زیادہ اصرار ہوا تو انھوں نے صاف صاف فرمایا "بخدا ان لوگوں کا خون تم پر حرام تھا" عبداللہ بن علی انتہا درجہ تند مزاج اور درشت خو تھا۔ اس جواب کو سنکر غصہ کے مارے لال پیلا ہو گیا، بولا "تم نے ایسا کیونکر کہا" امام عالی مقام نے جواب دیا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حق بنیاد ہے "کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت نہ پیش آئے۔ یا تو شادی شدہ ہو کر زنا کرے، یا قاتل ہو اور یا مرتد ہو جائے" اب عبداللہ بن علی نے پوچھا "کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟" امام اوزاعی نے سوال کیا "یہ کیونکر؟" عبداللہ نے کہا "کیا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت نہیں کی تھی؟" امام نے فرمایا "اگر وصیت کی ہوتی تو حضرت علیؓ کسی کو اپنی طرف سے حکم نہ بناتے" اس گفتگو کے بعد امام ہمام کو توقع کیا بلکہ یقین تھا کہ ان کی گردن اڑادی جائیگی، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ عبداللہ بن علی نے اگرچہ اس وقت بگڑ کر امام اوزاعی کو دربار سے نکلوا دیا مگر بعد میں ان کے پاس دنانیر کی ایک تھیلی بطور نذرانہ ارسال کی جس کو امام نے اسی وقت مستحقین میں تقسیم کر دیا۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اور شہزادے امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں گئے اور خلیفہ نے کہا کہ حدیث کی قرأت میں کروں گا، آپ سنئے مگر شرط یہ ہے کہ عام سامعین کو اپنے حلقے سے باہر کر دیجئے امام مالکؒ نے فرمایا "اگر خواص کی خاطر عوام کو محروم کر دیا جائیگا تو پھر خواص کو بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا" یہ جواب دیکر اپنے ایک شاگرد کو حکم دیا کہ حدیث کی قرأت شروع کریں انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

واقعات بیشمار ہیں، تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں جا بجا ان کا ذکر ہے کہاں تک انھیں بیان کیا جاسکتا ہے غرض یہ ہے کہ یہی علمار حق تھے جو موقع بموقع امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کر کے خلفاء وقت کو ان کی بے اعتدالیوں اور غلطیوں پر متنبہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح استبدادی نظام حکومت کے مفاسد کو زیادہ وسیع ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہادی نے وفات سے پہلے چاہا کہ اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام بنا کر اپنے بھائی ہارون رشید کو خلافت سے محروم کر دے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک مجلس طلب کی جس میں ہرثمہ بن اعین بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب اصل معاملہ پیش ہوا تو سب حاضرین خلیفہ کا رجحانِ خاطر دیکھکر خاموش تھے مگر ہرثمہ بن اعین نے کہا "اے خلیفہ تیرا یہ اقدام صحیح نہیں ہے کیونکہ تیرے باپ نے تجھے اور ہارون رشید دونوں ہی کو ولیعہد بنایا تھا۔ پھر اب اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو جو اس وقت اپنے بیٹے کے لئے بیعت لے رہا ہے وہ زیادہ قوی ثابت ہوگی بہ نسبت اس بیعت کے جو تیرے باپ نے ہارون کیلئے

لی تھی۔ جو شخص پہلی بیعت کو توڑ سکتا ہے وہ دوسری بیعت کو بھی توڑ سکتا ہے"۔ حالانکہ معاملہ بیٹے کا تھا لیکن خلیفہ ہادی ہرثمہ کی حق گوئی سے بددل نہیں ہوا اور اس نے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا تم سب کا برا ہو تم نے مجھکو دھوکہ میں رکھا۔ صرف میرے آقا (ہرثمہ) ہیں جنھوں نے میری خیرخواہی کا حق ادا کردیا"۔ اب خیال فرمائیے ہرثمہ نے اس وقت غیر معمولی جرأت سے کام لے کر امت کو کتنے بڑے فتنہ سے بچالیا۔

مامون رشید اور قاضی یحیٰی بن اکثم کے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مامون نے فرمان لکھوایا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت بھیجی جائے" لیکن قاضی صاحب کی بروقت مداخلت سے مامون کو یہ فرمان واپس لینا پڑا۔ اسی طرح ایک دفعہ مامون پر شیعیت کا غلبہ ہوا تو اس نے نکاح متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ قاضی صاحب کو اس کی خبر ہوئی دوڑے ہوئے آئے اور مامون کو سمجھایا کہ قرآنی نص کے مطابق نکاح متعہ اور زنا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مامون نے اپنی غلطی تسلیم کرلی اور فوراً متعہ کی حرمت کا اعلان کرادیا۔

صرف بنو امیہ اور بنو عباس کے درباروں کی ہی یہ خصوصیت نہیں ہے بلکہ جس جس ملک میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی کم وبیش ایسے علماء حق کا وجود برابر رہا ہے جو حکومت کی بے اعتدالیوں کی پردہ دری کرکے امر حق کا اعلان کرتے رہتے تھے اور ملک کو فتنوں سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مصر کا مشہور فرمانروا رکن الدین بیبرس بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ اس نے جہاد کے لئے مسلمانوں سے مقررہ رقم کے علاوہ کچھ مزید رقم جمع کرنی چاہی۔ صحیح مسلم کے مشہور شارح علامہ نووی نے اس کی مخالفت کی اور سلطان سے کہا "مجھکو معلوم ہے تو امیر بندقدار کا زرخرید غلام تھا اور ایک حبہ کا بھی مالک نہیں تھا۔ اب اللہ نے تجھکو سلطنت دیدی ہے اور تونے ہزاروں غلام خرید ڈالے ہیں جن کے تمام سامان طلائی ہیں۔ نیز تیرے محل میں سو کنیزیں ہیں جو زروجواہر سے لدی ہوئی ہیں، جب تک مجھکو یہ معلوم نہ ہوجائے کہ یہ سب قیمتی چیزیں تونے جہاد کے اخراجات کے لئے اپنے غلاموں اور باندیوں سے لے لی ہیں اس وقت تک میں غریب مسلمانوں کے مال

لے لینے کا فتویٰ تیرے حق میں نہیں لکھ سکتا" بیبرس علامہ کی اس حق گوئی سے ناراض ہو گیا اور ان کو شہر بدر کر دیا۔ بعد میں اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس نے یہ حکم منسوخ کر کے علامہ کو پھر دمشق میں آنے اور رہنے کی اجازت دے دی مگر اقلیم علم کے سلطانِ بے دیہیم و کلاہ کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ فرمایا "جب تک بیبرس موجود ہے میں نہیں آؤں گا" اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی بیبرس کی وفات ہو گئی۔

عباسی خلیفۂ مصر مستکفی باللہ کے عہد میں ذمی رعایا نے ایک درخواست دی کہ ذمی ہونے کی حیثیت سے ہم پر جو بندشیں لگی ہوئی ہیں وہ اٹھالی جائیں اور اس کے عوض ہم سات لاکھ دینار سالانہ ادا کرتے رہیں گے، وزیر اور خلیفہ دونوں کا رجحان تھا کہ اس درخواست کو قبول کر لیں، لیکن علامہ ابن تیمیہ نے اس میں مداخلت کر کے فرمایا "شریعتِ اسلام کے احکام کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں ہو سکتے" خلیفہ کو مجبوراً امام کے فتوے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اس نے ذمیوں کی درخواست مسترد کر دی۔

سلطنتِ آلِ عثمان کے مشہور فرمانروا سلیم اول نے ایک مرتبہ اپنی سلطنت کے مفتیٔ اعظم شیخ جمالی سے دریافت کیا "ملکوں کا فتح کرنا بہتر ہے یا قوموں کا مسلمان بنانا" شیخ نے کہا "قوموں کا مسلمان بنانا" سلطان نے یہ سن کر اعلان کرادیا کہ میری مملکت میں جو شخص مسلمان نہیں ہوگا قتل کر دیا جائیگا" اب مفتیٔ اعظم کو اس اعلان کی خبر ہوئی تو فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچے اور بتایا کہ آپ کا یہ حکم قرآن کے خلاف ہے غیر مسلموں سے جزیہ لیکر ان کو مذہب کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ مفتیٔ اعظم شیخ جمالی کی اس تصریح کے بعد سلطان نے اپنا حکم واپس لے لیا اور مسلمان ایک عظیم گناہ سے بچ گئے۔

علامہ عزالدین بن عبد السلام ساتویں صدی ہجری کے نامور علماء میں سے ہیں، ان کو جب تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ممالیک بحریہ سلطانِ مصر کے زر خرید غلام ہیں اور آزاد کردہ نہیں ہیں تو انھوں نے اعلانِ عام کرادیا کہ ان غلاموں کے تمام تصرفات خود مختارانہ ناجائز ہیں۔ آپ نے ان غلاموں کو حکم دیا کہ میں تم کو فروخت کروں گا۔ علامہ کے احباب نے بہت کہا کہ آپ کا یہ اقدام خطرہ سے خالی نہیں ہے مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار مصر کا

نائب السلطنت جو غلام تھا چند مددگاروں کی جماعت کو ہمراہ لیکر علامہ کو قتل کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوا مکان پر پہنچکر آواز دی، علامہ باہر آئے تو ان کی صورت دیکھتے ہی نائب سلطنت کانپ اٹھا اور رو کر بولا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا "میں تم لوگوں کو فروخت کرونگا کیونکہ تم بیت المال کی ملکیت ہو" چنانچہ ایسا ہی کیا۔

سلطان سنجر امام غزالیؒ کے اشاروں پر چلتا تھا، شہاب الدین غوری امام فخر الدین رازی کا بڑا معتقد تھا۔ حاجی الدبیر نے تاریخ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ میں ایک تفصیلی واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رازی نے غوری کے بعض عقائد غیر صحیحہ کی اصلاح کی تھی پھر صرف یہی نہیں کہ علمارِ حق کبھی کبھار خلفار کو ان کے اعمال وافعال پر ٹوکتے رہتے ہوں بلکہ انھوں نے مستقلاً کتابیں اور دساتیر لکھے تاکہ خلفار اور سلاطین ان پر عمل پیرا ہوں جیساکہ قاضی ابو یوسف نے ہارون رشید کے لئے کتاب الخراج لکھی۔ اسی طرح کا ایک دستور سیاسی ابن المقفع نے لکھا تھا۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ کی مشہور ضخیم کتاب "کتاب الاموال" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے چنانچہ اس کے پہلے باب میں ہی امام نے بادشاہ اور رعایا کے باہمی حقوق سے بحث کی ہے۔ امام مالک کا بھی ایک رسالہ مشہور ہے جو انھوں نے خلیفہ ہارون رشید کے نام لکھا تھا اور جس میں انھوں نے خلیفہ کو متعدد نصیحتیں کی ہیں۔

خلفار اور وزرار وامرار کی اصلاح کے علاوہ خارجی اثرات کے ماتحت ملک میں جو عقیدہ وعمل کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں علمارِ حق ان کا بھی مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب بغداد میں فسق وفجور عام ہونے لگا تو خالد الدریوش نے اس کی روک تھام کے لئے ایک جماعت بنائی۔ اسی طرح کی ایک جماعت سہل بن سلامۃ الانصاری نے بنا رکھی تھی دونوں کا مقصد یہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ان تمام عناصر فاسدہ کا استیصال کیا جائے جو مسلمانوں میں بدعملی کے پیدا ہونے کا سبب ہو رہے ہیں پھر حنابلہ نے فرقِ باطلہ کا مقابلہ جس اولوالعزمی اور ہمت وعالی حوصلگی سے کیا ہے ارباب خبر ونظر پر پوشیدہ نہیں۔ اس راہ میں ان علمار کو قید وبند کے مصائب سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا، جیساکہ امام مالک، امام احمد

بن حنبل اور امام ابو حنیفہؒ وغیرہ ائمۂ کبار کے ساتھ ہوا۔ لیکن پھر بھی ان کی صدائے حق پست نہیں ہوتی تھی اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چونکہ حکومت بہر حال اسلامی تھی اس لئے جلد یا بدیر اس آواز کا اثر ہوتا تھا اور مفاسد کی اصلاح کسی نہ کسی شکل میں ہو جاتی تھی۔ مامون رشید طبعاً وسیع المشرب اور ضرورت سے زیادہ روادار تھا مگر زنادقہ کے وجود کو وہ بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اور مہدی نے اس گمراہ فرقہ کے ساتھ جبر و تشدد کا جو معاملہ کیا تھا وہی مامون نے بھی اس کے ساتھ کیا۔

صوفیائے کرام کا اصلاحِ امت میں حصہ

علماء ربانیین کے دوش بدوش صوفیاء کرام کا بھی ایک گروہ تھا جو سلطنت و حکومت کے ہنگاموں سے الگ غیر مسلموں کو مسلمان اور مسلمانوں کو پختہ تر مسلمان بنانے میں نہایت خاموشی کے ساتھ مصروف تھا۔ یہ حضرات ایک طرف روحانی ریاضتوں اور باطنی اعمال و افعال کے ذریعہ مسلمانوں کا تزکیۂ نفس کرتے تھے اور دوسری جانب ملک ملک کی خاک چھانکر اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے تھے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان، افریقہ، چین اور جزائر شرق الہند جاوا، سماٹرا، ملایا بورنیو، نیوگنی سلیبیز اور فلپائن ان سب مقامات پر اسلام کی اشاعت بڑی حد تک صوفیاء کرام کی کوششوں کی ہی رہینِ منت ہے جو محض تبلیغِ اسلام کے لئے تنِ تنہا یا اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت لیکر یہاں آئے تھے اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بناتے تھے۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ نے راجپوتانہ میں، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور سلطان نظام الدینؒ اولیاء نے دہلی اور اس کے اطراف و اکناف میں۔ شیخ علی ہجویری نے پنجاب میں اسلام کا جو چراغ روشن کیا تھا اُسی کا صدقہ ہے کہ اس بتکدۂ ہند میں آج مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ شمالی افریقہ میں جو اذان کی تکبیریں سنائی دیتی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے قائم کرنے میں حضرت شیخ عبداللہ بن یس، محمد بن علی السنوی اور جماعت فلاحین کی کوششوں کو دخل نہیں ہے۔ سماٹرا، ملایا اور جاوا میں جو توحید کی گونج ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ شیخ عبداللہ عارف، سید برہان الدین، شیخ عبداللہ الیمنی، مولانا ملک ابراہیم، اور شیخ نور الدین ایسے

نفوسِ قدسیہ کی مساعیِ حسنہ کا اثرِ جمیل ہے۔

حکومتِ اسلامی کی عام برکات بہر حال یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہئے کہ یہ سب کچھ برکات اس بات کی تھیں کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت و سلطنت تھی وہ خود صاحبِ اقتدار و اختیار تھے۔ یہ حکومت بُری بھلی خواہ کیسی ہی ہو لیکن بہر حال تھی تو اپنی ہی۔ بادشاہ ذاتی طور پر کیسا ہی فاسق و فاجر ہو پھر بھی وہ مسلمان ہوتا تھا اور غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اس کی حمیتِ دینی و غیرتِ مذہبی کی رگ میں جوش پیدا ہو ہی جاتا تھا۔ تلوار جب اپنے ہاتھ میں تھی تو اس سے جہاں بعض اوقات خود اپنوں کے گلے کٹتے تھے دشمن کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام بھی اسی سے نکلتا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان میں جو بادشاہ متقی اور پرہیزگار ہوتے تھے مثلاً منصور، نورالدین، صلاح الدین، غیاث الدین اور اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ وہ تو خیر اسلامی شعائر و حدود کا احترام کرتے ہی تھے۔ ان کے علاوہ جو سلاطین عشرت پسند اور لذت کوش ہوتے تھے (باستثناء معدودے چند) وہ بھی اسلامی احکام کا احترام ملحوظ رکھنے میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ہارون جواری کے جھرمٹ میں بیٹھ کر دادِ عیش و طرب دیتا تھا مگر ساتھ ہی ہر شب میں سو رکعتیں پڑھتا تھا۔ جہانگیر خود دخترِ رز کی کاکلِ پیچاں کا اسیر تھا مگر مملکت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اس نابکار کو منہ لگا سکے۔ عدالتوں کے فیصلے قرآن و حدیث کی روشنی میں ہوتے تھے مسجدیں آباد تھیں جگہ جگہ اسلامی مدارس و مکاتب تھے جن میں اسلامی طریقہ پر بچوں کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ علماء اور مشائخ اطمینان سے دین کی خدمت کا کام کرتے تھے۔ سوسائٹی میں منہیات و محرمات کا چرچا عام نہیں ہو سکتا تھا مسلمان آزادی کی فضا میں سانس لیتے تھے کسی غیر کے غلام نہیں تھے۔ یہاں تک کہ انھیں شاید اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ مسلمان غیر مسلم حکومت کا محکوم ہو کر رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ہر قسم کے معاملات کے ابواب ملتے ہیں لیکن اس کے متعلق کوئی مستقل باب نہیں ملتا کہ مسلمان بدقسمتی سے اگر کسی غیر قوم کے محکوم ہو جائیں

توکس طرح زندگی بسر کریں۔ علاوہ ازیں اس پر بھی غور کیجئے کہ قرامطہ اور باطنیہ ایسے عظیم فتنے اسلام میں پیدا ہوئے۔ ان کا استیصال کس نے کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ علمائِ کرام نے تحریر اور تقریر سے ان کا مقابلہ کیا لیکن اگر اسلامی حکومتیں ان کی پشت پناہ نہ ہوتیں تو کیا یہ فتنے مٹ سکتے تھے، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے جو ملکی فتوحات حاصل کیں اُن سے ان کی نیت خواہ کچھ ہی ہو بہر حال اُن فتوحات کے چند نتائج لازمی طور پر ظاہر ہوئے۔ ایک یہ کہ مذہبِ اسلام کی موثر طریقہ پر اشاعت ہوئی، عربی زبان کو فروغ ہوا اور اسلامی تہذیب و معاشرت عالمگیر ہوگئی۔ بہر حال یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی۔

خاتمہ | مسلمانوں کے عروج و زوال کی یہ جو ملی جلی مختصر داستان آپ نے سُنی ہے اس سے یہ اندازہ ہوگیا ہو گا کہ جب تک مسلمان اسلام کے قوانین فطری پر عمل پیرا رہے، وہ برابر ترقی کرتے رہے۔ لیکن جب اُن میں اسلامی روح مضمحل ہونے لگی تو ان میں تنزل بھی پیدا ہونا شروع گیا۔ اس تنزل کی رفتار دفعی نہیں بلکہ تدریجی تھی۔ ہر گناہ کی ایک خاصیت ہوتی ہے جو جلد یا بدیر اس پر مرتب ہوتی ہے۔ ایک حکومت کا عظیم ترین گناہ یہ ہے کہ اس کے بادشاہ میں استبداد ہو۔ رعایا کی پرواہ نہ کرتا ہو، ملک کی آمدنی کو اپنے عیش و آرام پر خرچ کرنا اپنا حق سمجھتا ہو اور اپنی ذاتی منفعت کو ملک کے عام مفاد پر بہر حال ترجیح دیتا ہو، جب کسی حکومت سے یہ گناہ سرزد ہوتا ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم تو اس کو اس گناہ میں جتنا جتنا انہماک بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ اپنی موت سے قریب تر آتی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ ذاتی تعیش و آرام کی حد تک اگر فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے مگر ساتھ ہی وہ نظامِ مملکت سے غافل نہیں ہے اور رعایا کے معاملات میں عدل و انصاف کا سر رشتہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، قدرت ایسے بادشاہ سے درگذر کر سکتی ہے اور تاریخ میں اس کی متعدد نظیریں موجود بھی ہیں، لیکن ایک ظالم و جابر اور خود غرض و مطلب پرست حکومت کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

ہماری تاریخ ہمارے اچھے اور برے اعمال کی آئینہ دار ہے۔ مجھکو اس کا اعتراف ہے کہ گزشتہ اوراق میں میں نے مسلمان حکومتوں پر تنقید کرنے میں احتیاط کے باوجود کسی قدر زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے لیکن اس کا مقصد دوسروں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دینا نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ خدائے ارحم الراحمین تو ظالم ہے نہیں۔ اس بنا پر آج ہمارے اوپر جو ادبار مسلط ہے وہ یقیناً ہمارے گزشتہ اعمال کا ثمرہ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی اُن تمام بد عملیوں کا جائزہ لیں جو ہم نے تاریخ کے عہدِ ماضی میں کی ہیں۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان حکومت کا گناہ تنہا اس حکومت کا نہیں بلکہ پوری قوم کا گناہ ہے۔ اور اپنی ان بدعملیوں کا جائزہ لینے کے بعد بارگاہِ ایزدی میں صدق دل سے توبہ کرکے آئندہ کے لئے عہد صمیم کریں کہ ہم پھر ان گناہوں کا ارتکاب نہ کریں گے۔ ہمیں چاہیئے کہ اس عہد و پیمان کے ساتھ اپنے تنزل کی ویرانیوں کو عروج و اقبال کی آبادیوں میں تبدیل کردینے کے لئے سرفروشانہ طور پر اٹھیں۔

راہِ عمل ہمارے لئے متعین ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لَنْ يَصْلُحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا	اس امت کا آخر انھیں طریقوں سے اصلاح یاب ہوگا
صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا (اَوْكَمَا قَالَ)	جن سے اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی۔